Regd. L. No. 7243 Phone. 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

مئی 1971

ہندو کیا ہے؟
اور
کیا کرنا چاہتا ہے!

مضمون اندر ملاحظہ فرمائیے

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام - ۲۵ بی - گلبرگ - لاہور

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

بدلِ اشتراک

پاکستان
سالانہ ــــــــ دس روپے

غیر ممالک
سالانہ ــــــــ ایک پونڈ

قیمت فی پرچہ
ایک روپیہ

ٹیلیفون
۸۰۸۰۰

ــ خط و کتابت ــ
ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور

جلد ۲۴ | مئی (۱۹۷۱ء) | نمبر ۵

فہرست

(۱) لمعات ــــــــــــ ۳

(۲) دُرِّ منثور (علامہ اقبالؒ) ــــــــ ۲۲

(۳) گل ہائے عقیدت (محترم پرویز صاحب) ــــــــ ۲۵

(۴) ہندو کیا ہے اور کیا کرنا چاہتا ہے ــــــــ ۴۱

(۵) طلوعِ اسلام کا مسلک و مقصد ــــــــ ۸۰

ایڈیٹر: محمد خلیل۔ ناشر: سراج الحق۔ مقام اشاعت ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور۔ پرنٹر: شیخ محمد اشرف۔ مطبوعہ: اشرف پریس ایبک روڈ لاہور۔

مردِ جعفر[1]، زندہ روحِ او ہنوز

جعفر اندر ہر بدن ملت کش است — ایں مسلمانے کہن ملت کش است
گاہ او را با کلیسا ساز باز — گاہ پیشِ دیریاں اندر نیاز
دینِ او، آئینِ او سوداگری است — عنتری اندر لباسِ حیدری است
از نفاقش وحدتِ قومے دونیم — ملتِ او از وجودِ او لئیم!
ملتے را ہر کجا غارت گرے است — اصلِ او از صادقے[2] یا جعفرے است

الاماں از روحِ جعفر الاماں
الاماں از جعفرانِ ایں زماں

(اقبالؒ)

۱۔ بنگال کا ملعون غدار جس نے انتہائی سازش سے مملکت کو انگریزوں کے ہاتھ بیچ دیا تھا۔

۲۔ دکن کا مردود ازلی غدار۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْکُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ اِذْ ھَمَّ قَوْمٌ اَنْ یَّبْسُطُوْٓا اِلَیْکُمْ اَیْدِیَھُمْ فَکَفَّ اَیْدِیَھُمْ عَنْکُمْ۔ وَاتَّقُوا اللّٰہَ ۔وَعَلَی اللّٰہِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ۔(۵/۱۱)

اے مسلمانو! تم خدا کی اس نعمت کو یاد کرو جب ایک قوم نے تم پر دست درازی کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ (اور ہر قسم کا اہتمام کر لیا تھا کہ تمہیں مغلوب و محکوم کر لے) تو خدا نے ان کے ہاتھوں کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔ کتنا بڑا تھا خدا کا یہ احسان تم پر!

سو اب تم قوانینِ خداوندی کی پوری پوری نگہداشت کرو، اور ان کی حکمت اور نتیجہ خیزی پر کامل اعتماد کرو۔ جو لوگ ان قوانین کی صداقت پر ایمان رکھتے ہیں، ان کا یہی شعار ہوتا ہے۔

طلوع اسلام کی سابقہ اشاعت کے لمعات ۱۵ مارچ کو لکھے گئے تھے جب پاکستان کا مطلع نہایت مکدر تھا، اور مشرقی پاکستان کی فضاؤں میں بالخصوص جھکڑ چل رہے تھے۔ ایسے بگولہ خیز حالات میں کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ کل کو کیا ہوگا۔ اسی بیم و رجا کے عالم میں پرچہ پریس میں بھیجنا پڑا۔ پرچہ تو پریس میں چلا گیا لیکن ہماری حالت یہ تھی کہ کسی ان جانے، ان پہچانے، غیر متعین سے خطرہ کا غیر شعوری احساس بھیلاوے کی طرح ڈرا رہا تھا۔ اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ دل اس بُری طرح سے کیوں ڈوبا جا رہا ہے۔ جوں جوں دن گزرتے جاتے تھے، ہماری بے چینی اور بے کلی بڑھتی جاتی تھی۔ ہماری کیفیت یہ تھی کہ

دل دھڑکتا ہے، قدم رکتے ہیں گلشن کے قریب
آج کیوں ایسا اجالا ہے نشیمن کے قریب

ہماری یہ خلش وکاوش، یہ افسردگی و پژمردگی، یہ پریشانی اور دل گرفتگی بڑھتی جا رہی تھی کہ ۲۶ مارچ کی شام صدرِ مملکت کی اس نشریاتی تقریر نے جس کے ایک ایک لفظ سے خود اعتمادی اور بلند حوصلگی بے ساختہ جھلک جھلک کر فضا سے مملکت پر چھائی ہوئی مایوسیوں کو نئی امیدوں سے بدلتی جا رہی تھی، یہ اعلان کیا کہ پاکستان ایک بڑی ہولناک، عمیق اور تباہ کن سازش کی رو سے آتش فشانِ ہلاکت کے کنارے پر پہنچ چکا تھا کہ، فضلِ ایزدی سے اس پر قابو پا لیا گیا اور یوں یہ مملکتِ خداداد تباہ ہوتے ہوتے بچ گئی۔

خدائے ذوالمنن کا یہ کتنا عظیم القدر انعام ہے جس سے اس نے ہمیں نوازا ہے۔ اور اس کے ان انعامات کی بارش ہم پر پہلی بار نہیں ہوئی۔ اس کی رحمتوں کے بادبانوں نے ۱۹۴۷ء میں ہماری کشتی کو اسی طرح ڈوبنے سے بچایا۔ پھر ۱۹۶۵ء میں اس کے حفاظتی بندنے لپیٹے کف بردہان مہیب سیلاب کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔ جس کے ——— دامِ ہر موج میں تھا حلقۂ صد کامِ نہنگ ——— اس ذات ذوالجلال والاکرام کی ان نوازشہائے پیہم پر جس قدر سجدہ ہائے تشکر و امتنان بھی ادا کئے جائیں کم ہیں۔

اس کے ساتھ ہی ملتِ پاکستانیہ، اپنی مایۂ صد ناز، افواجِ قاہرہ، اور ان کے سربراہ، صدرِ مملکت کے اس عزمِ بلند اور خارہ شگاف ہمت پر تبریک و تحسین کے جس قدر پھول بھی نچھاور کرے، تھوڑے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ان عساکر کوہ شکن، فلک پیما اور بحر شگاف کی ہمتوں میں برکت اور ارادوں میں زیادہ سے زیادہ استحکام عطا فرمائے کہ یہی ہماری جانوں کے محافظ اور عزتوں کے پاسبان ہیں۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک حمداً کثیراً۔

صدرِ مملکت نے اپنی تقریر میں، شیخ مجیب الرحمٰن اور اس کے ساتھیوں کی غداری اور بغاوت کا اجمالی سا ذکر کیا تھا ——— اور وقت کا تقاضا بھی یہی تھا کہ اس خطرناک سازش کی تفاصیل کو ہنوز طشت از بام نہ کیا جائے۔ ——— ان کی اس اجمالی نقاب کشائی سے ملتِ پاکستانیہ تو مطمئن تھی، کہ جو کچھ اس سے پہلے بیان ہو رہا تھا، وہ اس کی صداقت کے ناقابلِ تردید شواہد تھے۔ لیکن ہو سکتا تھا کہ دیگر اقوامِ عالم اس پر پورا پورا یقین نہ کرتیں ——— لیکن وہ جو کہا گیا ہے کہ

جو چپ رہے گی زبانِ خنجر، لہو پکارے گا آستیں کا

تو، آستیں سے اس "لہو کی پکار" کا فریضہ، کینہ صفت، مردودِ ازلی، بھارتی حکومت کی سینہ کوبی اور غوغا آرائی نے ادا کر دیا۔ اصل یہ ہے کہ اس سازش کی بروقت گرفت سے، غدارِ ملت مجیب اور اس کے قوم فروش رفقاء کے بھیانک چہرے ہی بے نقاب نہیں ہوتے، اس سے ہندو کی دھوتی بھی اس بری طرح فضا میں اڑی ہے کہ

وہ بالکل ننگا ہو کر دنیا کے سامنے آگیا۔ چونکہ یہ سب کچھ اس کی توقعات کے خلاف ہوا، اس لئے اس پر خفقان کے دورے پڑنے شروع ہو گئے۔ اس نے اس سلسلہ میں جس قدر کذب و افتراء سے کام لیا ہے، جس قدر بے سروپا افسانے نشر کئے ہیں، جتنی فرضی داستانیں شائع کی ہیں، جتنے جھوٹ بولے ہیں، جس قدر بکواس کی ہے، وہ سب اس امر کی شہادت ہیں کہ وہ اس جھٹکے کی تاب نہ لاکر حواس باختہ ہو گیا اور پاگلوں کی سی حرکتیں کرنے لگ گیا۔ لیکن جیسا کہ ہم نے ابھی ابھی کہا ہے ہندو کے اس طرح حواس باختہ ہو کر ہذیان بکنے سے، دنیا کو یہ معلوم ہو گیا کہ یہ سازش کتنی گہری تھی اور اس میں کس کس کا ہاتھ، کس حد تک کارفرما تھا۔ اس نے ۲۶ مارچ سے مسلسل اس قسم کی خبریں نشر کرنی شروع کر دیں جن سے مترشح ہوتا تھا کہ مشرقی پاکستان ایک میدانِ جنگ ہے جس میں ایک طرف مجیب کی حامی فوجیں لڑ رہی ہیں اور دوسری طرف (انڈیا ریڈیو کے الفاظ میں) "مغربی پاکستان" (پاکستان نہیں بلکہ صرف مغربی پاکستان) کی فوجیں ان کا مقابلہ کر رہی ہیں۔ اس نے "بنگلہ دیش" کا آزاد ریڈیو بھی نصب کر دیا، اور اس سے نشریات کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔ اس نے یہ بھی مشہور کر دیا کہ مجیب گرفتار نہیں ہوا۔ آزاد ہے اور اپنی آزاد حکومت کا عنقریب اعلان کرنے والا ہے۔ اس نے اپنی پارلیمان میں مجیب کی اس سازش کے حق میں قرارداد بھی منظور کر دیں اور اس قسم کی آوازیں بھی بلند ہونے لگیں کہ بنگلہ دیش کی آزاد حکومت کو (جس کا وجود صرف اکاش وانی کی ہواؤں میں معلق تھا) تسلیم کر لیا جائے۔ اس نے یو۔ این کے سیکرٹری جنرل تک سے درخواست کر دی کہ وہ اس "افسانوی مملکت" کی حمایت میں آواز بلند کرے۔

ہندو کی ان مذبوحی حرکات سے پاکستان کا تو کچھ بگڑا نہیں، البتہ دنیا پر یہ حقیقت واشگاف ہو گئی کہ یہ سازش کس قدر وسیع و عمیق تھی اور ہندو اس میں کیا کردار ادا کر رہا تھا۔

اس جھگڑے میں صرف ہندو کی دھوتی ہی نہیں اڑی، اور بھی بہت سے منافق ننگے ہو گئے۔ برطانیہ اور روس نے ۲۶ مارچ سے بھی پہلے اس مہم کا آغاز کر دیا۔ ۲۳ مارچ کو یوم پاکستان کی تقریب منائی گئی تو برٹش ہائی کمیشن اور سوویت کونسل جنرل کی عمارت پر پاکستانی جھنڈے کے بجائے "بنگلہ دیش" کا جھنڈا لہرایا گیا۔ ہوٹل انٹرکانٹی نینٹل کی شاندار عمارت پر بنگلہ دیش کا سب سے بڑا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ برطانیہ کی (B.B.C.) اور امریکہ کی (V.O.A.) نے انڈیا ریڈیو کی ہمنوائی میں تمام وہمی اور جھوٹی خبروں کو مسلسل نشر کیا۔ آسٹریلیا اور جنوبی افریقہ کے ریڈیو اسٹیشنوں نے بھی ان کی ہمنوائی کی۔

یہ درحقیقت، ایک اعصابی جنگ (WAR OF NERVES) تھی جس میں تمام پاکستان دشمن قوتیں برابر کی شریک تھیں۔ جنرل ٹکا خان اور ان کے رفقاء مستحق تبریک و تہنیت ہیں کہ انہوں نے اس اعصابی جنگ کا بڑی ہمت اور استقامت سے مقابلہ کیا اور ایسے حوصلہ شکن حالات میں نہ تو ہمت ہاری

اور نہ ہی دامنِ ضبط و تحمل کو ہاتھ سے جانے دیا۔ امریکہ اور (بڑی حد تک) برطانیہ تو پہلے ہی بے نقاب تھے لیکن اس دفعہ روس ان سے بھی سبقت لے گیا۔ اس کی طرف سے ہندو کی حمایت اور پاکستان کی مخالفت کا بھرپور مظاہرہ ہوا۔ صدر یحییٰ نے صدر روس کے مراسلہ کا جو دنداں شکن جواب دیا ہے اس کے نقوش تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ مرتسم رہیں گے۔

ان منافقین نے جہاں اپنی دناءت اور خباثت کا اس طرح ثبوت دیا، چین نے ایک بار پھر مخلصانہ رفاقت کا حق ادا کر دیا۔ اس نے ۲۳ مارچ کو اپنے سفارت خانہ کی عمارت (واقعہ ڈھاکہ) پر پاکستانی پرچم لہرایا۔ پھر اس کی اخباری دنیا نے بھارت کو اس طرح لتاڑا کہ اسے جھرجھری لینی پڑی۔ اور اس کے بعد اس کے وزیر اعظم چو این لائی نے اپنے مراسلہ میں اپنی دوستی اور امداد کا ایسے فلسفیانہ انداز سے یقین دلایا کہ اس سے معلوم کون کون سے سیاسی محلات میں تزلزل واقع ہو گیا ہو گا۔ دنیا میں اس قسم کے مخلص معاونین کا میسر آجانا بھی یکے از نعمائے خداوندی ہے۔

———— (۱) ————

جہاں تک مجیب اور اس کے ساتھیوں کی غداری کا تعلق ہے، ہماری تاریخ میں یہ پہلا واقعہ نہیں۔ بغداد کی تباہی اور اس کے نتیجہ میں عباسی حکومت کا خاتمہ، تاریخ کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ یہ تباہی ہلاکو خان کے ہاتھوں سے ہوئی تھی۔ لیکن اُسے خود عباسی حکومت کے وزیر علقمی نے دعوت دے کر بلایا تھا۔ یہ داستان بڑی سبق آموز اور عبرت انگیز ہے۔ علقمی نے خلیفہ سے کہا کہ سلطنت کا خزانہ بڑا زیر بار ہو رہا ہے اس لئے اخراجات میں کمی کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ اس کی مؤثر ترین تدبیر یہ ہے کہ فوج میں کمی کر دی جائے۔ (آپ کو یاد ہو گا کہ شیخ مجیب الرحمن کی بھی یہی تجویز تھی کہ پاکستان کی فوج میں تخفیف کر کے ہندوستان سے رفاقت کا معاہدہ کر لیا جائے) سبکدوش سپاہیوں کے پاس کوئی ہنر تو تھا نہیں جس سے وہ اپنی روزی کما لیتے۔ انہوں نے ملک میں لوٹ مار شروع کر دی جس سے امن عامہ مختل ہو گیا۔ ملک میں ایسے حالات پیدا کر کے، علقمی نے ہلاکو کو دعوت بھیج دی کہ حالات بڑے مساعد ہیں جلد آجایئے۔ اس طرف علقمی تھا اور دوسری طرف ہلاکو خان کا مشیر بھی خیر سے ایک مسلمان ہی تھا، اور مسلمان بھی بڑا نامور۔ نصیر الدین طوسی۔ ان دونوں کی سازش سے ہلاکو نے بغداد پر حملہ کیا اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ مؤرخین کے اندازے کے مطابق اس قتل عام میں قریب ایک۔ کروڑ چھ لاکھ مسلمان، زن و مرد، بچے بوڑھے قتل کر دیئے گئے۔ لوٹ مار اور غارت گری اس وسیع پیمانے پر ہوئی کہ یہ قیامت خیز حادثہ تاریخ میں ضرب المثل بن گیا۔

ہلاکو نے خلیفہ مستعصم باللہ کو قتل کرنا چاہا، تو علقمی اور طوسی کی انتقام جوئی نے ایک اور ستم ظریفی کی۔ ہلاکو سے کہا کہ مسلمانوں کے نزدیک ان کے خلیفہ کا وجود بڑا مقدس ہوتا ہے اس لئے اس کے خون کا قطرہ زمین پر نہیں گرنا چاہیئے۔

چنانچہ ان کی تجویز کے مطابق، خلیفہ کو بند سے میں لپیٹ کر، لاتوں سے کچلوا دیا گیا۔ لیکن تاریخ نے خود علقمی کا یہ عبرت انگیز انجام بھی اپنے صفحات میں محفوظ کر دیا کہ ہلاکو نے اسے یہ کہہ کر دھتکار دیا کہ تو نے جب اپنے آقا سے بے وفائی کی ہے تو میرا کب وفادار رہیگا۔ اس لئے وہ کتے کی موت مر گیا۔

اور دکن کے غدار میر صادق، اور بنگال کے میر جعفر کی سازشیں تو ابھی کل کی بات ہے۔ ان دونوں نے مسلمانوں کی دو عظیم سلطنتوں کو جس طرح تباہ کرایا تھا وہ بھی ہماری تاریخ کا عبرت ناک المیہ ہے۔ اسی بنگال کی مٹی سے اب مجیب کی نمود ہوئی ہے۔ یہ اللہ کا احسان ہے کہ اس سازش کو بروقت ناکام بنا دیا گیا ورنہ جو تباہی اس کے نتیجہ میں رونما ہونے والی تھی۔ وہ بغداد کی تباہی سے کسی صورت میں بھی کم نہ ہوتی۔

ملک و ملت کے ساتھ غداری کا جرم کس قدر سنگین اور مہیب ہے اس کا کچھ اندازہ لگانا ہو تو جاوید نامہ میں علامہ اقبالؒ کی وہ نظم[1] سامنے لائیے جس میں انہوں نے اپنی عالم بالا کی سیر کے دوران، صادق و جعفر کی کریہ انگیز اضطراب خیز اور صد ہزار عبرت آمیز حالت کا نقشہ کھینچا ہے۔ اس میں انہوں نے بتایا ہے کہ ان رذیل ارواح کو جب دوزخ میں جھونکنے کے لئے لایا گیا تو دوزخ نے بھی انہیں قبول کرنے سے پناہ مانگی اور کہا کہ

گفت دوزخ را خس و خاشاک بہ
شعلۂ من زیں دو کافر پاک بہ

اور اس کے بعد کہا کہ

ایں بہاں بے ابتدا بے انتہا است
بندۂ غدار را مولا کجا است

یعنی غدار کی ذلیل روح کو جہنم بھی قبول نہیں کرتی۔ وہ اس کے ناپاک وجود سے اپنی آگ کو ملوث نہیں کرنا چاہتی ـــــ فی الواقعہ غدار کی کیفیت یہی ہے۔

(ضمناً) مجیب کی جو تصویر (بعد از گرفتاری) اخبارات میں شائع ہوئی ہے اسے دیکھ کر ہمیں بڑی کوفت ہوئی بلکہ یوں کہیئے کہ دل کو ایک دھکا سا لگا۔ اسے کراچی ایئرپورٹ پر V.I.P. (یعنی VERY IMPORTANT PERSONS) کے خصوصی پر تکلف کمرہ میں، ایک نرم و نازک صوفہ پر براجمان دکھایا گیا ہے ـــ ملک و ملت کا ایسا ذلیل اور سنگین مجرم اور (V.I.P.)؟ یہ ہو سکتا ہے کہ ایئرپورٹ پر وقتہ کے دوران (V.I.P.) کے کمرہ کے علاوہ کوئی اور مقام مناسب اور محفوظ نہ ہو، اس لئے اس مجرم کو مجبوراً وہاں رکھنا پڑا ہو لیکن قوم کے

---

[1] ہم نے اس نظم سے مقتبس چند اشعار صفحہ اول پر درج کئے ہیں۔

قلوب بہرحال ایسے غدار کو ایسی شکل میں دیکھنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ قوم اس قسم کے مجرموں کی لاشوں کو سولی پر لٹکتے دیکھنا چاہتی تھی ـــــ اور یہ کچھ ہم اپنی طرف سے نہیں کہہ رہے۔ یہ قرآن کا مطالبہ ہے۔ قرآن کریم میں پہلے یہ بتایا گیا ہے کہ انسانی جان اس قدر واجب الاحترام اور گراں بہا ہے کہ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ - فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا۔ جس کسی نے کسی ایک جان کو ناحق تلف کر دیا، یوں سمجھو، گویا اس نے پوری کی پوری نوعِ انسان کو ہلاک کر دیا ـــــ ہاں، مگر اس میں ایک استثنیٰ ہے۔ اور وہ یہ کہ کسی کو جرم قتل کی سزا کے طور پر سزائے موت دی جائے یا " ملک میں فساد برپا کرنے " کی پاداش میں۔

اس کے بعد اس اجمال کی تفصیل ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے کہ

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ - ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ - (۵/۳۳)

یعنی جو لوگ، خدا اور اس کے رسول (یعنی اسلامی مملکت) کے خلاف علمِ بغاوت بلند کریں اور ملک میں بدامنی اور لاقانونیت پھیلائیں، ان کی سزا یہ ہے کہ انہیں قتل کر دیا جائے یا صلیب پر لٹکا دیا جائے۔ یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ دیئے جائیں، یا انہیں جلاوطن کر دیا جائے۔ جس نوعیت کا جرم ہو، اس کے مطابق سزا دی جائے۔ یہ سزا ان کے لئے دنیاوی زندگی میں ذلت و رسوائی کا موجب ہوگی اور آخرت کا عذاب اس کے علاوہ ہوگا۔ اور وہ اس سے بھی زیادہ سخت ہوگا۔

یہ ہے قرآنِ کریم کی رُو سے جرمِ بغاوت اور غداری کی سزا! صدرِ مملکت نے شیخ مجیب اور اس کے ساتھیوں کو واضح الفاظ میں غدار اور باغی قرار دیا ہے ـــــ اور جو کچھ انہوں نے کیا اور جو ان کے عزائم تھے، ان کے پیشِ نظر ان کے جرم کے اثبات کے لئے کسی مزید شہادت کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اس لئے ضروری ہے کہ انہیں جلد از جلد کیفرِ کردار تک پہنچایا جائے۔ اگر اس کے لئے کسی قانونی تقاضا کا پورا کرنا ضروری ہے تو ہمارا مشورہ یہ ہے کہ اسے پورا کرنے میں بھی تاخیر سے کام نہیں لینا چاہیئے۔ اس قسم کے مجرموں کا زندہ رکھنا بڑے مہیب خطرات کا موجب ہو سکتا ہے، بالخصوص جب اتنی اتنی بڑی خارجی طاقتیں ان کی پشت پناہ ہوں۔ اور وہ "بنگلہ دیش" کی آزاد حکومت کو متشکل، اور اسے تسلیم کرنے کے منصوبے بنا رہی ہوں۔ آج کے ساوآت (بابت ۱۳ اپریل) میں، ہندوستان کے اخبار "ہندوسماچار" کا ایک خبر شائع ہوا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ شیخ مجیب الرحمٰن بنگلہ دیش کی مملکت کے سلسلہ میں اپنے رفقاء کے نام ہدایات نافذ کرتے ہیں۔ اس میں

شبہ نہیں کہ اس قسم کی خبریں وضعی اور جھوٹی ہیں لیکن سانپوں کے زندہ رکھنے میں خطرات کے امکانات تو بہرحال موجود ہوتے ہیں۔ اسی لئے قرآن کریم نے کہا ہے کہ اَلْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ۔ فتنے (کی موجودگی) قتل سے زیادہ سنگین اور خطرناک ہوتی ہے۔

بہرحال یہ ہم نے اپنی صوابدید کے مطابق مشورۃً عرض کیا ہے۔ جس حکومت نے اتنی گہری سازش کا قلع قمع کر کے، مشرقی بنگال میں پھر سے امن بحال کر دیا ہے، وہ اس فتنہ سے بے خبر نہیں ہو سکتی۔ اس لئے ہمیں، اس معاملہ کو اس (حکومت) کی صوابدید پر چھوڑتے ہوئے، آگے بڑھنا چاہیئے۔

(۲)

ملک میں اس وقت جو خلفشار رونما ہوا ہے، اس میں شبہ نہیں کہ اس کا براہ راست تعلق شیخ مجیب اور اس کی پارٹی سے ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اصل سوال اس سے کہیں گہرا ہے۔ وہ نہ شیخ مجیب اور اسکے رفقاء تک محدود ہے اور نہ ہی موجودہ خلفشار سے مختص۔ جیسا کہ ان صفحات پر متعدد بار لکھا جا چکا ہے، تشکیل پاکستان کے ساتھ ہی، بڑے بڑے ذمہ دار حضرات کی طرف سے اس قسم کے بیانات دیئے جانے شروع ہو گئے تھے کہ ملک میں پاکستان دشمن عناصر موجود ہیں اور ان کی طرف سے محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد خود ارباب نظم و نسق کی طرف سے اس قسم کے بیانات بھی منصہ شہود پر آتے رہے ہیں کہ ملک میں ایسی پارٹیاں موجود ہیں جنہیں پاکستان دشمن خارجی حکومتوں کی طرف سے امداد ملتی ہے۔ ملک میں یہ مطالبے ابھرتے رہے کہ اس قسم کے ملک دشمن عناصر کی نشاندہی کی جائے اور اس قسم کی پارٹیوں کے خلاف ضروری اقدامات کئے جائیں تاکہ یہ فتنہ آگے نہ بڑھنے پائے۔ اس سلسلہ میں کیا تدابیر اختیار کی گئیں اور ایسے عناصر کے خلاف کیا اقدامات کئے گئے، قوم کو اس کا کچھ علم نہیں۔ اس سے عام خیال یہی پیدا ہوتا ہے کہ اس ضمن میں کوئی مؤثر تدابیر اختیار نہیں کی گئیں اور اس فتنے کو بڑھنے اور پھیلنے کی مہلت دے دی گئی جس سے وہ موجودہ خلفشار (بلکہ کھلی ہوئی بغاوت) کی شکل میں سامنے آ گیا۔ قوم شکر گزار ہے موجودہ عسکری نظام کی کہ اس نے اس کا اس عزم اور حزم سے مقابلہ کیا اور ملک کو تباہی سے بچا لیا۔ لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ اب ملک کو پوری طرح کنگھالا جائے، اور دشمن عناصر کو جڑ بنیاد سے اکھیڑ کر رکھ دیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی اس قسم کی تدابیر اختیار کی جائیں کہ اس قسم کے عناصر پھر سے زمین گیر نہ ہونے پائیں خواہ اس کے لئے کیسی ہی بطش شدید سے کیوں نہ کام لینا پڑے۔ اگر موجودہ فتنہ کی سرکوبی کے بعد اس قسم کی تدابیر اختیار کر لی گئیں تو جو قربانیاں اس وقت دی گئی ہیں، ان کا پورا پورا صلہ مل جائے گا۔ یاد رکھئے! نہ کوئی قوم ساری کی ساری خراب ہوتی ہے اور نہ ہی وہ از خود فساد انگیزیوں پر آمادہ ہوتی ہے۔ یہ چند افراد ہوتے ہیں جو قوم کو بگاڑ دیتے ہیں اور انہیں ختم کر دینے سے فساد کا سرچشمہ بند

ہو جاتا ہے۔ جب حضرت صالحؑ کو قوم ثمود کی اصلاح کے لئے مامور کیا گیا تو آپ کو خیال پیدا ہوا کہ یہ اتنی بڑی قوم جو سر سے پاؤں تک بگڑی ہوئی ہے، اس کی اصلاح کس طرح ہو سکے گی؟ اس پر آپ سے کہا گیا کہ پوری کی پوری قوم نہیں بگڑی ہوئی۔ كَانَ فِي الْمَدِينَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ (۲۷/۴۸) ملک کے مرکزی مقام میں صرف نو "گھاگ" ہیں جو سارے ملک میں فساد برپا کراتے رہتے ہیں اور اصلاح کی کوئی صورت پیدا نہیں ہونے دیتے۔ ان کی سرکوبی کر دی جائے تو قوم صحیح راستے پر آجائے گی۔ فساد کی یہی علت، حضرت صالحؑ کے زمانے میں تھی اور یہی آج ہے اور اصلاح کا جو طریق اس وقت تجویز کیا گیا تھا وہی آج بھی مؤثر ہو سکتا ہے۔

(۲)

اب اس داستان کا اگلا باب سامنے لائیے۔ داغؔ کا (اس کے اپنے انداز کا) ایک عامیانہ سا شعر ہے۔

محشر میں لوگ اپنی مصیبت میں مبتلا
یاں یہ تلاش آئے کوئی خوبرو پسند

ملک اس وقت ہیم و رجا کے دوراہے پر کھڑا ہے، لیکن مفاد پرست گروہ اس تاک میں ہیں کہ اس صورتِ حال سے فائدہ کس طرح اٹھایا جائے۔ گزشتہ انتخابات میں جن پارٹیوں کو شکست ہوئی تھی ان کی پہلے دن سے یہ خواہش تھی کہ کوئی صورت ایسی پیدا ہو جائے جس سے وہ انتخابات کالعدم قرار پا جائیں اور انہیں دوبارہ طالع آزمائی کا موقع میسر آجائے۔ ان شکست خوردہ پارٹیوں میں جماعتِ اسلامی کی حالت سب سے زیادہ زبوں تھی کیونکہ وہ (الیکشن سے پہلے) اپنی حکومت قائم کرنے کے خواب دیکھ رہی تھی۔ آپ کو یاد ہوگا کہ جب ۷ دسمبر کی شام کو انتخابات کے نتائج ٹپکنے لگے تھے اور ہر اعلان پر یہ نظر آرہا تھا کہ جماعتِ اسلامی کس بری طرح سے ناکام ہو رہی ہے تو اس کی طرف سے شور مچا دیا گیا تھا کہ انتخابات میں دھاندلی ہو رہی ہے، انہیں کالعدم قرار دیا جائے۔ (اس جماعت کے نزدیک "دھاندلی" سے مراد ہر وہ نتیجہ ہوتا ہے جو ان کے خلاف جائے) لیکن ان کی کسی نے نہ سنی اور انتخابات برقرار رہے۔ اس کے بعد ان کی کوشش یہ تھی کہ ملک میں ایسے حالات پیدا ہو جائیں، کہ کامیاب پارٹی (پیپلز پارٹی) کی حکومت قائم نہ ہو سکے ـــــ پنجاب میں، ایک چار سال پہلے کی شائع شدہ کتاب کے خلاف ایجی ٹیشن اور سندھ میں لسانی تضیہ کی آڑ میں فسادات، اسی "مقدس زنجیر" کی مختلف کڑیاں تھیں لیکن یہ واقعات بھی کچھ مفید مطلب ثابت نہ ہوئے۔ اب جو مشرقی پاکستان میں حشر برپا ہوا ہے تو (یوں کہیے کہ) بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ چنانچہ مودودی صاحب کی طرف سے فوراً یہ تجویز پیش کر دی گئی ہے کہ

۷ اور ۱۷ دسمبر کے انتخابات کو اب قطعی کالعدم قرار دے دینا چاہیئے۔ کیونکہ جن حالات

میں یہ انتخابات ہوئے اور جو حالات ان انتخابات کے بعد پیش آئے ان کا منطقی نتیجہ یہی ہے کہ اس ساری اسکیم کو ساقط کر دیا جائے جس کے تحت یہ انتخابات کرائے گئے تھے۔

(ایشیا - ۱۱ اپریل ۱۹۷۱ء)

یعنی — ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے۔

نئے انتخابات کے سلسلہ میں انہوں نے کہا ہے کہ ان کے لئے کسی جدید آئین کے مرتب کرنے کی ضرورت نہیں۔

> ہمارے پاس پہلے سے تین دستور موجود ہیں۔ ان میں سے جو دستور سب سے زیادہ ان تقاضوں کو پورا کرتا ہے جنہیں ملحوظ رکھ کر صدر صاحب نے ون یونٹ توڑنے، آبادی کی بنیاد پر نمائندگی دینے اور لیگل فریم ورک آرڈر نافذ کرنے کا فیصلہ کیا تھا وہ ۱۹۵۶ء کا دستور ہے۔ اس دستور کو ایک ایسی اسمبلی نے تیار کیا تھا جو دستور سازی ہی کے لئے بنائی گئی تھی اور اس کے بنانے میں مشرقی اور مغربی پاکستان کے تمام مسلم لیڈر شامل تھے۔ (ایشیا - ۱۱ اپریل ۱۹۷۱ء)

اوائل ۱۹۷۰ء میں جب جماعتِ اسلامی نے اپنا انتخابی منشور شائع کیا ہے تو اس وقت مودودی صاحب سے متعین طور پر یہ سوال کیا گیا تھا کہ آپ ۱۹۵۶ء کے آئین پر جو اس قدر زور دے رہے ہیں تو ۱۹۵۶ء کے آئین کو اپنا لینے کی تجویز کیوں نہیں کرتے۔ اس کے جواب میں آپ نے کہا تھا کہ

> ۱۹۵۴ء کا دستور اس لئے آئینی دستاویز نہیں ہے کہ ابھی اس کے پاس ہونے کی نوبت نہیں آئی تھی کہ دستور ساز اسمبلی کا بوریا لپیٹ دیا گیا تھا۔ اگر یہ پاس ہو جاتا اور ملک کا دستور قرار پا جاتا تو ہم اس کی بحالی پر اصرار کرتے۔ (ایشیا - ۴ جنوری ۱۹۷۰ء)

یعنی اس وقت ۱۹۵۶ء کا دستور آئینی دستاویز تھا، ۱۹۵۴ء کا دستور یہ حیثیت نہیں رکھتا تھا اور اب ۱۹۵۴ء کا دستور آئینی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے، ۱۹۵۶ء کا دستور ایسی حیثیت نہیں رکھتا۔ یہ ہم عندالضرورت کسی اور وقت بتائیں گے کہ اس پلٹے سے مفہوم کیا ہے۔ واضح رہے کہ مودودی صاحب کی طرف سے اس قسم کی روش (کہ وہ آج کچھ کہتے ہیں کل کچھ) کچھ نئی نہیں۔ ان کی ساری عمر اسی طرح گذر گئی ہے۔ اب — آخری وقت میں کیا خاک مسلمان ہوں گے؟ بہرحال، مودودی صاحب اب اس ادھیڑبن میں مصروف ہیں کہ کسی طرح نئے انتخابات ہوں — یہ الگ بات ہے کہ نئے انتخابات میں وہ چار نشستیں بھی چھن جائیں جو سابقہ الیکشن میں کسی نہ کسی طرح ان کی جھولی میں آپڑی تھیں لیکن وہ اس سے اس خیال سے باز تھوڑے ہی آجائیں گے۔ ان کی تو حالت یہ ہے کہ

یہ تو نے کیا کہا ناصح' نہ جانا کوئے جاناں میں
ہمیں تو رہروؤں کی جوتیاں کھانا مگر جانا

ڈر نہیں یہ ہے کہ وہ اب کے کوئی اور فتنہ کھڑا نہ کر دیں۔ اس کی داغ بیل وہ ابھی سے ڈال رہے ہیں۔ (اس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں) اس کا خاکہ مرتب کرنے کے لئے وہ آجکل بیماری کی رخصت (SICK LEAVE) پر ہیں اگرچہ یہ بیماری کی رخصت بھی عجیب انداز کی ہے جس میں کیفیت یہ ہے کہ

ہے چشم نیم باز' عجب خواب ناز ہے
فتنہ تو سو رہا ہے' در فتنہ باز ہے

ہم ملک کی دوسری جماعتوں (بالخصوص پیپلز پارٹی) سے تاکیداً عرض کریں گے کہ وہ اس نازک موقعہ پر بڑی احتیاط سے کام لیں اور اس جماعت (اسلامی) کے بچھائے ہوئے دام ہمرنگِ زمین میں اُلجھ نہ جائیں۔

(۹)

اس وقت ہم اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے کہ انتخابات از سرِ نو ہونے چاہئیں یا نہیں۔ اس وقت ہم اتنا ہی عرض کریں گے کہ مغربی پاکستان میں نئے انتخابات قطعاً نہیں ہونے چاہئیں۔ اس کے لئے وجہ جواز کوئی نہیں اور خطرات کا امکان ضرور ہے۔ جہاں تک مشرقی پاکستان کا تعلق ہے' وہاں کے حالات بالکل مختلف ہیں۔ وہاں' سوائے ایک نشست کے' تمام کی تمام نشستیں اس عوامی لیگ نے حاصل کر لی تھیں جسے اب قانوناً کالعدم قرار دے دیا گیا ہے اور جس طرح انہوں نے یہ نشستیں حاصل کی تھیں' اب وہ راز بھی طشت از بام ہو گیا ہے۔ وہ اُسی سازش کی ایک محکم کڑی تھا۔ اس لئے ان انتخابات کو بہر نوع کالعدم قرار دیا جانا چاہیئے۔ ہمیں یہ دیکھ کر حیرت اور افسوس ہوا کہ بعض حلقوں کی طرف سے یہ کہا جا رہا ہے کہ اگرچہ عوامی لیگ قانوناً ممنوع قرار دیدی گئی ہے' لیکن اس کے باوجود جو امیدوار اس کے ٹکٹ پر منتخب ہوئے تھے' وہ بدستور اسمبلی کے ممبر ہیں۔ وہ بدستور ممبر ہیں یا نہیں' ہم پوری قوت کے ساتھ کہیں گے کہ انہیں قطعاً ممبر نہیں رہنے دینا چاہیئے۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ شیخ مجیب نے انہی افراد کو امیدواری کے ٹکٹ دیئے تھے جو اس کے ہم خیال تھے اور جن پر اسے پورا پورا اعتماد تھا۔ کیا آپ تصور کر سکتے ہیں کہ یہ حضرات مجیب کے عزائم سے بے خبر اور اس کے پروگرام سے لاتعلق تھے؟ جو ایسا سمجھتا ہے اُسے اپنی عقل و بصیرت کا ماتم کرنا چاہیئے۔ تو ذرا سوچئے کہ (مجیب اور اس کے چند ایک قریبی رفقاء کو چھوڑ کر جو اس خلفشار میں اپنی موت آپ مر گئے ہوں' یا جن پر مقدمہ چلایا جائے) اس پورے کے پورے "بارود خانے" کو مجلس آئین و قوانین ساز کے ایوانات میں لاجمع کرنا جانتے بوجھتے اپنی ہلاکت کا سامان' اپنے ہاتھوں فراہم کرنا نہیں تو اور کیا ہوگا؟ حقیقت یہ ہے کہ مجیب یا تو قوت کے نشہ میں بدمست ہو گیا' اور یا اسکے

خارجی حمائتیوں کے مصالح کا ایسا تقاضا تھا جو اس نے کھلم کھلا بغاوت اختیار کر لی، ورنہ اگر وہ آئینی روش پر چلتا رہتا، اور کسی سے بظاہر بگاڑتا نہیں، تو وہ چپکے ہی چپکے، وہ سب کچھ کر جاتا جو کچھ وہ کرنا چاہتا تھا۔ جیسا کہ ہم نے شروع میں کہا ہے، یہ خدا کا احسان تھا کہ یہ شخص یوں نشہ میں بہک گیا اور اس کی سازش بے نقاب ہو گئی۔ اب اگر اس کی پوری کی پوری پارٹی کو اسمبلی میں لا بٹھایا جاتے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ جو کچھ مجیب کرنا چاہتا تھا لیکن (اپنی حماقت یا ہماری خوش قسمتی سے) نہ کر سکا، اس کے پورا کرنے کا موقعہ اس کی پارٹی کو بہم پہنچا دیا جائے! یا للعجب!! تاریخ ہمارا پہلا جرم تو شاید معاف کر دے لیکن اگر ہم نے دیدہ دانستہ ان لوگوں کو پھر سے اس کا موقعہ فراہم کر دیا تو اس جرم کو تاریخ کبھی معاف نہیں کرے گی۔ ہمارے نزدیک ضرورت اس کی ہے کہ مشرق اور مغرب دونوں بازوؤں کی (سابقہ عوامی لیگ کے اراکین کی فہرستیں حاصل کر کے، انہیں کم از کم دس سال تک کے لئے، اسمبلیوں کی رکنیت بلکہ حق رائے دہندگی سے قانوناً محروم کر دیا جائے۔ اس پارٹی کی سازش کوئی چھوٹی سازش نہیں تھی جسے یونہی فراموش کر دیا جائے اور سانپ کو مار کر سپولیوں کو دودھ پلا پلا کر پالا جائے ــــ مملکتِ پاکستان کے تحفظ اور سالمیت کے علی الرغم کسی فرد کا کوئی حق بھی مسلم نہیں۔ باقی رہے اس (عوامی لیگ) کے باہر کے وہ سیاسی لیڈر جو مجیب کے ہمنوا تھے، سو ان کی پوزیشن دو حال سے خالی نہیں۔ اگر وہ مجیب کے عزائم سے واقف ہونے کے باوجود ایسا کر رہے تھے، تو وہ بھی جرم سازش میں برابر کے شریک سمجھے جانے چاہئیں۔ اور اگر وہ کہیں کہ وہ مجیب کے عزائم کو سمجھ نہیں سکے تھے، تو جن لوگوں کی سیاسی بصیرت کا یہ عالم ہو، انہیں سیاسی لیڈر کس طرح قرار دیا جا سکتا ہے اور انکی رہنمائی (لیڈرشپ) پر بھروسہ کیسے کیا جا سکتا ہے!

جہاں تک ملک کے نظم و نسق کا تعلق ہے، ہمارے نزدیک اس کے لئے، بحالاتِ موجودہ اس قسم کی شکل مناسب رہیگی کہ:

(۱) مارشل لاء بدستور نافذ رہے۔

(۲) مرکز میں، صدرِ مملکت اپنے مشیر مقرر کرے جنہیں وزراء کا درجہ دے دیا جائے۔ ان کے انتخاب کے سلسلہ میں حسب ذیل اصول پیشِ نظر رکھے جائیں۔

(و) مرکزی اسمبلی کے لئے، مغربی پاکستان سے پیپلز پارٹی کو اکثریت حاصل ہوئی تھی اسلئے ان وزراء کا تقرر، پیپلز پارٹی کے سربراہ کے مشورہ سے کیا جائے۔

(ب) دیگر پارٹیوں کو، ان کے کامیاب شدہ اراکین کی تعداد کی نسبت سے نمائندگی دی جائے۔

(ج) مشرقی پاکستان سے، وہاں کے گورنر کے مشورہ سے وزراء کا انتخاب عمل میں لایا جائے۔

(۳) چونکہ ایسے امور جن کا تعلق لوگوں کی روزمرہ کی زندگی سے ہے، صوبوں کی تحویل میں رہتے ہیں، اس لئے

صوبوں میں وزرا کے تقرر کے سوال پر مختلف پارٹیوں کے درمیان اختلافات پیدا ہو جانے کا امکان ہے۔ اس کے لئے یا تو "گورنر راج" ہی کی شکل قائم رکھی جائے، لیکن اگر یہاں بھی وزراء کا تقرر قرین مصلحت سمجھا جائے تو ان کا تقرر اسی طرح عمل میں لایا جائے جس طرح پارلیمانی نظام میں کابینہ کی تشکیل کی جاتی ہے۔ لیکن مشرقی پاکستان میں یہ صورت قابلِ عمل نہیں ہوگی۔ اس لئے وہاں گورنر اپنی صوابدید کے مطابق اپنے مشیر مقرر کرے۔

لیکن مرکز ہو یا صوبے، عوامی لیگ کے ممبروں میں سے کسی کو کسی شکل میں بھی شریکِ حکومت نہ کیا جائے۔

(۴) صدرِ مملکت یا اکثریتی پارٹیوں کے سربراہ اگر چاہیں تو وہ ایسے حضرات کو بھی وزیر مقرر کر لیں جو سابقہ الیکشن میں کہیں سے بھی منتخب نہ ہوئے ہوں۔ پارلیمان بہرحال نہ مرکز میں ہوگی نہ صوبوں میں۔

(۵) اس دوران میں صدرِ مملکت، ملک کے ان ماہرینِ آئین و قوانین حضرات پر جن کی پاکستان کیساتھ وفا شعاری شک و شبہ سے بالا ہو، مشتمل ایک کمیٹی مقرر کرے جو مملکت کے لئے آئین کا مسودہ مرتب کرے۔ (اگر اس کمیٹی کا تقرر عمل میں آگیا تو ہم، آئین کے سلسلہ میں، اپنی تجاویز ان کے گوش گزار کر دینگے۔)

——— (۰) ———

عبوری دور کے انتظامات کے بعد مملکت کے مستقبل کی طرف آئیے۔ اس سلسلہ میں پہلے کُل پاکستان مسائل کے متعلق گفتگو کی جائے گی اور اس کے بعد مغربی اور مشرقی بازوؤں کے مسائل سے متعلق۔

جیسا کہ ہم متعدد بار لکھ چکے ہیں، ہماری اصل خرابی کی بنیاد مغرب کا جمہوری نظام ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب مغرب کی استعماری مملکتوں نے اپنی کالونیز سے ڈیرا ڈنڈا اٹھایا تو جاتے جاتے ان کے کان میں ایک ایسا ابلیسی افسون پھونک دیا جس سے وہ مسلسل تشتت و انتشار کا شکار رہیں۔ یہ افسون تھا جمہوری اندازِ حکومت۔ اسے انہوں نے کچھ ایسے انداز سے ان کے دلوں میں راسخ کیا کہ یہ ان کے نزدیک وحی منزل من اللہ کی طرح مقدس اور غیر متبدل قرار پا گیا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اگر کوئی شخص اس نظام کے خلاف ایک لفظ تک بھی زبان پر لائے تو سننے والوں کی کیفیت کچھ ایسی ہو جاتی ہے گویا اس نے ان کا دھرم بھرشٹ کر دیا ہو۔ یہ ہے ساحرینِ مغرب کی ساحری کا اثر۔

مغربی نظامِ جمہوریت کے بنیادی اصول یہ ہیں کہ:

(۱) اقتدارِ اعلیٰ ملک کے عوام کو حاصل ہے۔ اقتدارِ اعلیٰ (SOVEREIGNTY) سے مراد یہ ہے کہ ان کا فیصلہ آخری اور قطعی ہوگا۔ کوئی اور طاقت نہ اسے مسترد کر سکے گی، نہ اس میں ردّ و بدل کی مجاز ہوگی۔ گویا امورِ مملکت کے باب میں عوام کو اختیارِ مطلق حاصل ہوگا — وہ جو جی چاہے کریں، اور جس قسم کے جی چاہے آئین اور قوانین مرتب کریں۔

(۲) چونکہ یہ عملاً ناممکن ہوگا کہ ملک کے کروڑوں افراد آئین و قوانین سازی میں براہِ راست حصہ لے سکیں،

اس لئے وہ اپنا یہ اختیار اپنے ان نمائندوں کی طرف منتقل کر دیں جنہیں وہ انتخابات کے ذریعے منتخب کریں۔

(۳) ان انتخابات کی رُو سے جس پارٹی کے افراد تعداد میں سب سے زیادہ ہوں، اقتدار اعلیٰ اُس پارٹی کو حاصل ہوگا۔ بالفاظِ دیگر، پارلیمان کی اکثریتی پارٹی، مملکت کے مطلق اختیارات کی مالک ہوگی۔

ان بنیادی اصولوں کا ماحصل یہ ہے کہ اکثریتی پارٹی مملکت کے متعلق جو فیصلہ کرے، وہ قولِ فیصل ہوگا اور اسے ایسا کرنے سے کوئی نہیں روک سکیگا۔

اس سے واضح ہے کہ اگر اکثریت کی پارٹی کسی وقت چاہے تو ایسا فیصلہ بھی کر سکتی ہے جس سے اس مملکت کا جداگانہ وجود ہی باقی نہ رہے اور وہ کسی دوسری مملکت کا جزو بن جائے۔

آپ فوراً چونک کر کہیں گے کہ نہیں! ایسا نہیں ہو سکتا! بات چونک اٹھنے کی ہے ہی۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ یہ جمہوری نظام کا ایک فطری نتیجہ ہے۔

اس پر بھی آپ کہیں گے کہ نہیں! وہ ایسا نہیں کر سکتی۔ اسے مملکت کو ختم کرنے کا اختیار حاصل نہیں ہونا چاہیئے۔ سوال یہ ہے کہ اس کے اختیارِ مطلق پر یہ پابندی کس طرح عائد کی جا سکتی ہے! اختیارِ مطلق پر خارجی پابندی! یہ باہمدگر متضاد ہیں۔

لیکن آپ پھر بھی یہی کہیں گے کہ متضاد ہیں یا متوافق۔ اس کے اختیارات پر پابندی ضرور عاید کی جانی چاہیئے۔

اور یہی بات ہم پہلے دن سے کہتے چلے آ رہے ہیں کہ جمہوری نظام کو امرِ مطلق نہیں ہونا چاہیئے، اسے بعض اصولوں کے تابع رہنا چاہیئے۔ اسے ہم نے (CONTROLLED DEMOCRACY) کی اصطلاح سے تعبیر کیا تھا۔ سیکولر مملکتوں کو اس قسم کے اصول کس طرح متعین کرنے چاہئیں، اس سے ہمیں بحث نہیں۔ اسلامی مملکت میں یہ ضوابط، قرآن کے وہ غیر متبدل اصول ہیں جنہیں اس نے واضح الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ چونکہ پاکستان کا دعویٰ ہے (بلکہ اس کا وجود ہی اس دعویٰ پر مبنی ہے) کہ یہ ایک اسلامی مملکت ہے اس لئے اس کا نظامِ جمہوریت قرآن کے ان اصولوں کے تابع رہے گا۔ اس کا عملی طریق یہ ہوگا کہ انتخابات کے وقت، ہر امیدوار کو اس شرائط نامہ پر دستخط کرنے ہونگے کہ اس کا انتخاب یا حق رکنیت ان اصولوں سے مشروط ہوگا۔ اگر اس نے کسی وقت کوئی ایسا اقدام کیا جس سے یہ اصول مجروح ہوتے ہوں تو اس کا انتخاب کالعدم قرار پا جائے گا۔

سابقہ انتخابات میں، صدر مملکت کے (C.M.L.O.) کو اس قسم کی کنٹرولنگ اتھارٹی حاصل تھی۔ اگر اسوقت (یعنی انتخابات سے پہلے) ہر پارٹی کے انتخابی منشور کو اس کی روشنی میں پرکھ لیا جاتا اور مختلف پارٹیوں اور ان کے امیدواروں کو عملاً اس کا باضابطہ پابند کر لیا جاتا، تو یا تو عوامی لیگ اس قسم کا طلسم پیدا نہ کرتی اور یا مجیب صاحب کے خفیہ عزائم بہت پہلے طشت از بام ہو جاتے۔

یہ ضمنی بات تھی۔ اب ہم پھر اصل سوال کی طرف آتے ہیں اور وہ سوال یہ ہے کہ اس امر کا فیصلہ کون کرے گا کہ کسی امیدوار یا اکثریتی پارٹی کا کوئی قدم اصولی ضوابط کے خلاف ہے۔ ہماری تجویز یہ تھی (اور ہے) کہ یہ حق مملکت کی عدالتِ عالیہ کو حاصل ہونا چاہیئے۔

اور اس کے بعد آتا ہے سب سے مشکل سوال، اور وہ یہ کہ اگر وہ پارٹی عدالتِ عالیہ کے فیصلے کو بھی تسلیم نہ کرے تو پھر کیا کیا جائے؟ اس کا جواب اسکے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ اسے قوت کے بل پر اس فیصلہ کے سامنے جھکایا جائے۔ بلکہ یوں کہیئے کہ بنیادی اصولوں سے سرکشی برتنے کی پاداش میں، اس سے اختیارات چھین لئے جائیں۔

یہ سوال مشکل ترین اس لئے ہے کہ مغربی نظامِ جمہوریت کی رُو سے مملکت کی قوت (فوج) بھی برسرِ اقتدار جماعت ہی کے تابع ہوتی ہے۔ لہٰذا اس قسم کی متنازعہ فیہ صورت میں عدالتِ عالیہ یا کوئی اور ادارہ برسرِ اقتدار پارٹی کے خلاف آئینی طور پر کچھ کر ہی نہیں سکتا۔ یہ مغربی انداز جمہوریت کا بنیادی نقص ہے۔ برطانیہ وغیرہ مغربی ممالک کی قومیں تو ایک عرصہ سے اس نظام میں ڈھلی چلی آتی ہیں اس لئے ان میں ایسے مواقع بہت کم آتے ہیں، لیکن نوآزاد شدہ اقوام میں ایسے جھگڑے آئے دن اٹھتے رہتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے ہاں مسلسل خلفشار رہتا ہے۔

اس باب میں ہمیں قرآن کریم سے بڑی عقدہ کشا راہ نمائی ملتی ہے۔ سورۂ حجرات میں ہے وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا۔ اگر مسلمانوں کی دو پارٹیاں آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں صلح کرا دو۔ فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِیْ تَبْغِیْ حَتّٰى تَفِیْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ .... (۴۹/۹) "اس کے بعد اگر ان میں سے کوئی پارٹی سرکشی برتے اور دوسری پارٹی پر چڑھ دوڑے تو تم اس سرکش پارٹی کے خلاف جنگ کرو تاآنکہ وہ امر اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دے"۔ اس سے واضح ہے کہ قرآن کریم ملک میں امن و آئین کے قیام کے لئے ایک تعمیری پارٹی کی موجودگی ضروری قرار دیتا ہے جو صاحبِ قوت ہو اور جو ایسے وقت میں قانونِ خداوندی (امر اللہ) کو برقرار رکھنے کے لئے قوت کا استعمال کرے۔ ظاہر ہے کہ بحالتِ موجودہ یہ تعمیری پارٹی فوج ہو سکتی ہے۔ مملکت کی حکمران پارٹی اور عدالتِ عالیہ میں تنازعہ کی جو شکل ہم نے (مثال کے طور پر) اوپر بیان کی ہے اس میں عدالتِ عالیہ معاملہ کو فوج کی طرف (REFER) کر دے اور فوج کی تینوں شاخوں (بری، بحری، فضائیہ) کے سربراہ متفقہ طور پر فیصلہ کریں کہ اس تنازعہ کو کیسے ختم کرایا جائے۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ یہ تمام ادارے ہی مملکت فروشی پر متفق ہو جائیں تو پھر کیا کیا جائے تو اس کا جواب صاف اور سیدھا ہے کہ جس قوم کے تمام کے تمام نمائندے غدار ہوں، اسے آزادی کا حق ہی کیا حاصل ہے! وہ غیروں کی محکومی کے شکنجے میں کسی رہے۔ آزادی تو آزاد رہنے کی صلاحیت چاہتی ہے۔ جس قوم میں اسکی صلاحیت نہیں وہ غیروں کی غلام رہے گی۔ (اللہ کا شکر ہے کہ پاکستان میں ابھی یہ حالت پیدا نہیں ہوئی)

بہرحال، ہم سمجھتے ہیں کہ مغربی نظام کی اندھا دھند تقلید کے بجائے ہمیں اپنے حالات پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیئے اور ان کے مطابق جمہوری نظام میں ضروری ترمیم و تنسیخ کر لینی چاہیئے۔ مشرقی اور مغربی بازوؤں میں نمائندگی کے اصول، اور مغربی پاکستان میں صوبائی تقسیم (ون یونٹ) جیسے مسائل پر بھی اپنے مخصوص حالات کی روشنی میں ازسرِنو غور کرنا چاہیئے اور سب سے بڑھ کر، دو قومی نظریہ کی روشنی میں، غیر مسلموں کی آئینی پوزیشن پر بھی۔ عجیب اور بجا رت کی سازباز سے قطع نظر، ہماری مشکلات کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہم نے مغرب کے جمہوری نظام میں، اپنے مخصوص حالات کی روشنی میں ضروری ردو بدل نہیں کیا۔ وہ نظام کوئی آسمانی صحیفہ نہیں جسے من و عن قبول اور نافذ کرنا ضروری ہو۔

---(۰)---

اس میں شبہ نہیں کہ حکومت اس وقت، حالیہ سازش کے پیدا کردہ مسائل سے نپٹنے کے لئے ہمہ تن مصروف ہے۔ اور اسے کرنا بھی ایسا ہی چاہیئے، لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اس کے ساتھ ساتھ حسبِ ذیل امور کی طرف توجہ مبذول کرنے کی بھی اشد ضرورت ہے:۔

(۱) حالیہ سازش کے سلسلہ میں (از ابتدا تا انتہا) جو معلومات حکومت نے فراہم کی ہیں انہیں (بجز ان کے کہ جنکا انتشار درست مناسب نہ ہو) ایک کتابچہ کی شکل میں طبع کر کے، اس کی عام اشاعت کی جائے۔ اسی طرح، صدرِ مملکت نے، شیخ مجیب کو راہِ راست پر لانے کے لئے جو اقدامات کئے ان کی تفصیل سے بھی ملک کو بہرہ ور کرنا چاہیئے۔

(۲) اس سازش میں جو جو شخصیتیں کسی نوع سے بھی ملوث تھیں، ان کے چہرے بے نقاب کئے جائیں تاکہ عوام، ملک کے دشمنوں اور بہی خواہوں میں امتیاز کر سکیں۔ اس قسم کی مستند معلومات کی عدم موجودگی میں ملک میں جس قسم کی قیاس آرائیاں اور چہ میگوئیاں عام ہوتی رہتی ہیں، ان سے نقضِ عامہ کا بڑا خطرہ ہوتا ہے۔

(۳) ملک میں جس قدر ایسا لٹریچر پھیلا ہوا ملے جو بالواسطہ یا بلاواسطہ اس سازش کا موید تھا، اسے ضبط کیا جائے۔ اور آئندہ ایسا انتظام کیا جائے کہ اس قسم کا ایک لفظ بھی ملک میں عام نہ ہونے پائے۔

(۴) مشرقی پاکستان میں جو کچھ ہوا ہے، اس سلسلہ میں ایک عجیب چیز سامنے آئی۔ جن جماعتوں نے تحریکِ پاکستان کی مخالفت کی تھی، ان سے متعلق افراد کو اکثر کہتے سنا گیا کہ "کیوں؟ وہی ہوا نا جو ہم کہتے تھے۔ غلط نظریات پر مبنی مملکتوں اور قومیتوں کا یہی حشر ہوا کرتا ہے" وغیرہ وغیرہ۔ ان کی طرف سے اس قسم کے الفاظ کا بے ساختہ اظہار اس آتشِ انتقام کی غمازی کرتا ہے جو ابھی تک ان کے سینوں میں دب رہی ہے۔ ان لوگوں نے ابھی تک پاکستان کو دل سے نہیں اپنایا۔ ایسے لوگوں کی حرکات و سکنات پر کڑی نگاہ رکھنے کی ضرورت ہے۔

(۵) ایک عرصہ سے یہ خیال عام کیا جا رہا ہے کہ گزشتہ تئیس سال میں مغربی پاکستان نے مشرقی پاکستان کو لوٹ لیا ہے، حالانکہ اس سلسلہ میں جو اعداد و شمار جستہ جستہ سامنے آتے ہیں وہ اس مفروضہ کی تردید کرتے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس باب میں حکومت کی طرف سے مستند قرطاس ابیض شائع کیا جائے تاکہ قیاس آرائیاں اور ان سے مستنبط کردہ نتائج پر مبنی افواہوں کا خاتمہ ہو سکے۔ اس سلسلہ میں یہ بھی بتایا جائے کہ تشکیلِ پاکستان کے وقت مشرقی اور مغربی پاکستان کی معاشی حالت کیا تھی، اور اس کے بعد اس میں کہاں تک ترقی یا تنزل ہوا اور اسکے اسباب کیا تھے۔

(۶) اگر اس سال (یا اسکے بعد جب بھی) مردم شماری کرائی جائے تو اس سلسلہ میں مشرقی پاکستان میں بالخصوص احتیاطی تدابیر اختیار کی جائیں۔ پچھلے دنوں دیکھا گیا کہ مشرق و مغرب میں بُعد و منافرت پھیلانے میں آبادی کے اعداد و شمار کے افسانوں سے بھی بڑا کام لیا گیا تھا۔

یہ (اور اس قسم کی دیگر) تجاویز اور تدابیر وقتی، ہنگامی اور فوری ہیں، لیکن ملک میں جو کچھ ہوا ہے، اس کی بنیادی وجہ وہی ہے جس کے متعلق ہم تئیس سال سے مسلسل دہائی دیتے "چلے آ رہے ہیں" اور وہ یہ کہ قوم کی تشکیل و تعمیر قرآنی نظریۂ حیات پر کی جائے (جسے عام طور پر نظریۂ پاکستان کہا جاتا ہے)۔ مشرقی پاکستان کے مخصوص حالات کے پیشِ نظر ہم اس ضمن میں بہت سی تجاویز اپنے سامنے رکھتے ہیں لیکن موجودہ ہنگامی حالات ان پر غور و فکر کے لئے مساعد نہیں۔

اس وقت سب سے اہم اور بنیادی مسئلہ خود مملکتِ پاکستان کے بقا اور استحکام کا ہے۔ بھارت کی روش سے تو یوں نظر آتا ہے گویا وہ ہمارے ساتھ دوسری جنگ کے لئے تلا بیٹھا ہے۔ اس کے ساتھ ہی روس اور امریکہ کی حمایت بھی اُسے حاصل ہے۔ حال ہی میں ہندوستان میں ایک کتاب شائع ہوئی ہے جس کے مصنف STATESMAN کے ایڈیٹر (مسٹر KULDIP NAYAR) ہیں اور کتاب کا نام ہے (INDIA, THE CRITICAL YEARS) اس میں بتایا گیا ہے کہ

> جب کشمیر کا مسئلہ یو۔ این میں پیش ہوا تھا تو ماسکو نے اسے ویٹو کر دیا تھا۔ جب ۱۹۵۵ء میں بلگانن (جو اس زمانے میں روس کا وزیر اعظم تھا) اور خورو شیف (جو اس زمانے میں روس کی کمیونسٹ پارٹی کا فرسٹ سیکرٹری تھا) ہندوستان آئے تھے تو انہوں نے واضح الفاظ میں کہا تھا کہ کشمیر ہندوستان کا اٹوٹ انگ ہے۔ خورو شیف نے یہاں تک بھی کہہ دیا تھا کہ اگر نئی دہلی کو ہماری امداد کی کبھی بھی ضرورت پڑے تو اُسے صرف ایک آواز دینے کی ضرورت ہوگی۔ ہم پہاڑوں کے دوسری طرف ہی تو ہیں۔ (کوئی دور تھوڑے ہیں) 　　(صفحہ ۱۱۶)

اسی طرح مسٹر نیّر نے کہا ہے کہ

جب ہندوستان نے گوا پر چڑھائی کی ہے تو روس نے اسکے اس اقدام پر اسے سراہا تھا۔ جب یہ مسئلہ یو۔ این کے سامنے پیش ہوا تو مسٹر کوسیگن نے کہا تھا کہ ہندوستان نے جو کچھ کیا ہے اس سے عالمگیر امن کو تقویت حاصل ہو گی۔ (صفحہ ۱۲۰)

جب ۱۹۶۲ء میں ہندوستان نے چین کے خلاف جنگ چھیڑی تو مسٹر بی کے نہرو امریکہ میں ہندوستان کا سفیر تھا اور مسٹر ڈین رسک امریکہ کا فرسٹ سیکرٹری آف سٹیٹ۔ اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے مسٹر نہرو نے کہا کہ:

ہماری دشواری یہ ہے کہ مغربی بنگال سے محاذ جنگ تک ٹینک بھیجنے کے لئے ہمیں بڑا لمبا راستہ اختیار کرنا پڑتا ہے کیونکہ اگر سیدھی سمت سے جائیں تو راستے میں مشرقی پاکستان آجاتا ہے۔

اس پر رسک صاحب نے فرمایا کہ

سفیر صاحب! آپ وہاں پکنک منانے نہیں جانا چاہتے، اپنے ملک کی حفاظت کے لئے جانا چاہتے ہیں۔ اپنے ٹینک مشرقی پاکستان سے گزارتے ہوئے سیدھے لے جائیے۔ (صفحہ ۱۳۸)

ادھر چین کے سلسلے میں مسٹر کرشنا مینن نے بڑے فخر سے کہا تھا کہ "ہم نے چین کے قریب چار ہزار مربع میل رقبہ پر زبردستی قبضہ کر لیا ہے لیکن (ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ) ہمیں اس کی داد ہی نہیں دی جاتی"۔ (صفحہ ۱۳۰)

مسٹر نیر نے اس امر کا انکشاف بھی کیا ہے کہ

جب نیپال کے حکمران مہندرا نے ہندوستان کے اشاروں پر ناچنے سے انکار کر دیا تو ہندوستان نے نیپال کے اندر بغاوت کھڑی کر دینے کی کوشش کی اور جو نیپالی ہندوستان میں آ بسے تھے، اُن سے نیپال پر باہر کی طرف سے حملہ کرا دیا لیکن چونکہ نیپال کی اندرونی آبادی نے باغیوں کا ساتھ نہ دیا اسلئے ہندوستان کو اپنی پالیسی بدلنی پڑی۔ (صفحہ ۲۱۶)

یہ ہیں انڈیا، امریکہ اور روس جو اس وقت پاکستان کی مخالفت پر تلے بیٹھے ہیں۔ انڈیا نے شور مچا رکھا ہے کہ مشرقی پاکستان کا مسئلہ مملکت پاکستان کا اندرونی مسئلہ نہیں۔ اس کی حیثیت بین الاقوامی ہے۔ روس کے صدر نے انڈیا کے اس مؤقف کی کھلے بندوں تائید کر دی ہے اور اگرچہ امریکہ نے اس سے پہلے واضح طور پر اس کی تائید نہیں کی تھی لیکن آج (۱۰ راپریل) کے اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ ہندوستان میں امریکہ کے سفیر مسٹر کیٹنگ نے بھی کہا ہے کہ ایسٹ پاکستان کا مسئلہ 'پاکستان کا اندرونی مسئلہ نہیں' بین الاقوامی معاملہ ہے۔

ان قرائن و شواہد سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ قوتیں پاکستان کے خلاف جارحانہ اقدام کا سوچ رہی ہیں۔ اس سلسلے میں ہمیں یو۔ این۔ او سے بھی کسی منصفانہ اقدام کی توقع نہیں رکھنی چاہیئے۔ یہ ادارہ جو کچھ ہمارے ساتھ شروع سے کرتا چلا آرہا ہے وہ ہمارے سامنے ہے لہذا ہمیں اپنی مدافعت کی طرف سے قطعاً غافل نہیں ہونا چاہیئے ... اس سلسلے

میں ہم قوم کی توجہ قرآنی تعلیم کے ایک خاص گوشے کیطرف مبذول کرانا ضروری سمجھتے ہیں۔ داستانِ بنی اسرائیل کے ضمن میں اس نے کہا ہے کہ صدیوں کی محکومی اور غلامی سے اس قوم کی حالت یہ ہو چکی تھی کہ خدا نے ان سے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ فلسطین کی سرزمین تمہارے نام لکھی جا چکی ہے۔ آگے بڑھو اور اس کا قبضہ لے لو۔ اس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ نہ موسیٰ! وہاں تو بڑے جابر لوگ بستے ہیں۔ ہم ان سے لڑائی مول نہیں لے سکتے۔ وہ وہاں سے نکل جائیں تو ہم اندر داخل ہو جائینگے۔ جب ان سے کہا گیا کہ تم پاگل ہو گئے ہو وہ وہاں سے ازخود کیسے نکل جائینگے۔ تم آگے بڑھو اور انہیں وہاں سے نکال باہر کرو تو اس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ موسیٰ!

فَاذْهَبْ أَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا إِنَّا هَاهُنَا قَاعِدُونَ ۔ (۵/۲۴)

تو اور تیرا رب جاؤ اور ان سے جنگ کرو۔ جب تم ان پر غالب آجاؤ تو ہمیں آواز دینا۔ ہم فوراً آجائیں گے۔ ہم یہیں بیٹھے ہیں۔

ہماری بھی یہی حالت ہو چکی ہے۔ ہم ہر بات کے لئے کہہ دیتے ہیں کہ حکومت کو یہ کرنا چاہیئے اور حکومت کو وہ کرنا چاہیئے۔ گویا قوم کے لئے کرنے کا کچھ نہیں، سب کچھ حکومت کے کرنے کا ہے۔ ذمہ داریاں سب کی سب حکومت کی ہیں، ہمارے صرف حقوق ہیں جن کا پورا کرنا حکومت کا فریضہ ہے۔ یہ انداز نگاہ غلط ہے مملکت پاکستان تنہا اربابِ حکومت کی نہیں، ساری قوم کی ہے، اس لئے مملکت سے متعلق مسائل، ساری قوم کے مسائل ہیں۔ یہ صرف تقسیم کار ہے جس کی رُو سے بعض ذمہ داریاں اربابِ نظم و نسق کو تفویض کر دی گئی ہیں۔ لیکن اس سے قوم اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش نہیں ہو گئی۔ کارگاہِ مملکت تو کھیل کے میدان کی طرح ہے جس میں پوری کی پوری قوم، ایک ٹیم کی طرح مصروفِ جدوجہد ہوتی ہے اور اس میں کامیابی یا ناکامی کسی ایک فرد یا گروپ کی نہیں بلکہ پوری کی پوری ٹیم کی ہوتی ہے۔ قرآن کریم کی رُو سے استخلاف فی الارض کی امانت صرف اربابِ نظم و نسق کے سپرد نہیں کی جاتی۔ اس میں ساری امت برابر کی شریک ہوتی ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ عام حالات میں ہماری ذہنیت بھی "فاذھب انت و ربک" کی سی ہو گئی ہے۔ لیکن بعید از اعترافِ حقیقت و سپاسی گزاری ہو گا اگر ہم اس کا ذکر نہ کریں کہ گزشتہ جنگِ ستمبر ۱۹۶۵ء میں قوم نے جس عزم و ہمت، ولولہ و طنطنہ، جوش و خروش، ثبات و استقامت، اور اپنی سایہ نما افواج کے ساتھ جس تعاون (بلکہ احترام) کا ثبوت دیا تھا، اس سے بنی اسرائیل کی ذہنیت کی نہیں بلکہ صدرِ اول کے مسلمانوں کی روشِ زندگی کی یاد تازہ ہو گئی تھی۔ ہمیں امید ہی نہیں، یقینِ کامل ہے کہ اگر اس وقت پھر ہندو کی شامتِ اعمال اُسے اِس طرف کھینچ لائی، تو قوم، ۱۹۶۵ء سے بھی زیادہ ثبات و استقامت سے اس کا مقابلہ کریگی۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک ہندو کو ایک فیصلہ کن شکست نہیں دی جاتی، وہ نہ خود چین سے بیٹھے گا، نہ کسی ہمسایہ کو چین سے

بیٹھنے دے گا۔ کیا عجب کہ مجیب کی ذلت آمیز اور رسوا کن شکست، ہندو کی فیصلہ کن شکست کا پیش خیمہ ثابت ہو۔

حالات جس تیزی سے بدل رہے ہیں ہم نہیں کہہ سکتے کہ جس وقت یہ سطور قارئین کی نظروں کے سامنے آئیں، یہاں کیا صورت ہو۔ لیکن حالات کی رفتار اور انداز کچھ بھی ہو ضرورت ہے کہ ہم مومن کی زندگی کی اس تعریف (DEFINITION) پر پورے اتریں جسے حضور نبی اکرم نے ان جامع الفاظ میں بیان فرمایا تھا کہ

مومن کی زندگی یہ ہے کہ جب جہاد ہو رہا ہو تو وہ اس میں شریک ہو، اور جب نہ ہو رہا ہو تو وہ اس کی تیاری میں مصروف ہو۔

محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن کریم

لاہور
ہر اتوار ۸½ بجے صبح
۲۵۔ بی، گلبرگ ۲، لاہور

راولپنڈی
بروز جمعہ (بذریعہ ٹیپ) ۵ بجے شام
بمقام الکوثر، مری روڈ

ملتان
بروز جمعہ (بذریعہ ٹیپ) بعد نماز مغرب
بمقام
شاہ محمد اینڈ سنز
بیرون پاک گیٹ

کراچی
ہر اتوار (بذریعہ ٹیپ) ۹½ بجے صبح
بمقام
دفتر بزمِ طلوعِ اسلام فردوس مارکیٹ
پہلی چورنگی، ناظم آباد، کراچی

دُرِّ منثُور

اُن موتیوں میں سے چند ایک جو اقبال کے مکتوبات و دیگر تحریراتِ نثر میں جا بجا بکھرے پڑے ہیں!

(۱)

لیگ کا مستقبل

آئین کے مطابق اعلیٰ عہدے امراء کی اولاد کے لئے وقف ہیں اور نچلے درجے کے عہدے وزیروں کے دوستوں اور رشتہ داروں کا حصہ ہیں۔ دیگر امور میں ہمارے سیاسی اداروں نے عامۃ المسلمین کا عمومی درجہ بلند کرنے کا کبھی خیال تک نہیں کیا۔ پیٹ کا مسئلہ دن بدن لاینحل ہوتا جا رہا ہے۔ مسلمان نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا ہے کہ وہ دو سو سال سے ذلیل سے ذلیل تر ہوتا جا رہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ مسلمان کے افلاس کا مسئلہ کیسے حل کیا جائے۔ لیگ کا سارا مستقبل اس مسئلہ کے حل پر منحصر ہے۔ اگر لیگ اس مسئلہ کے حل سے قاصر رہی تو مجھے یقین ہے کہ عوام اس سے دور رہیں گے۔ خوش قسمتی سے اس کا حل اسلامی آئین کی تنفیذ میں ہے۔ طویل غور و فکر کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر اس شرعی آئین کو کما حقہٗ سمجھ کر نافذ کر دیا جائے تو کم از کم ہر ایک کا حقِ معیشت تو محفوظ ہو جاتا ہے۔ موجودہ زمانے کے پیدا کردہ مسائل کا حل ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں کے لئے زیادہ آسان ہے۔

(قائداعظمؒ کے نام خط ۱۹۳۷ء)

مغربی سیاست

جن نام نہاد مدبرین کو انسانوں کی قیادت اور حکومت سونپی گئی تھی وہ خونریزی، سفاکی، کمزوری اور ظلم کے دیوتا ثابت ہوئے۔ جن حاکموں کا یہ فرض تھا کہ اخلاقِ انسانی کے نوامیسِ عالیہ کی حفاظت کریں، انسان کو انسان پر ظلم کرنے سے روکیں اور انسانیت کی ذہنی اور عملی سطح کو بلند کریں، انہوں نے ملوکیت و استعمار کے جوش میں لاکھوں، کروڑوں مظلوم بندگانِ خدا کو ہلاک و پامال کر ڈالا۔ صرف اس لئے کہ ان کے اپنے مخصوص گروہ کی ہوس کی تسکین کا سامان بہم پہنچایا جائے۔

(ریڈیو تقریر ۱۹۳۸ء)

انحطاط کا جادو

انحطاط کا سب سے بڑا جادو یہ ہے کہ یہ اپنے صید پر ایسا اثر ڈالتا ہے جس سے انحطاط کا مسحور اپنے قاتل کو اپنا مربی تصور کرنے لگ جاتا ہے۔ یہی حال اس وقت مسلمانوں کا ہے۔

(سراج الدین پال کے نام خط ۱۹۱۶ء)

ایرانی اثرات

ہندوستان کے مسلمان کئی صدیوں سے ایرانی تاثرات کے اثر میں ہیں۔ ان کو عربی اسلام سے اور اس کے نصب العین اور غرض وغایت سے آشنائی نہیں۔ ان کے لٹریری آئیڈیل بھی ایرانی ہیں اور سوشل نصب العین بھی ایرانی۔ میں چاہتا ہوں کہ اس مثنوی میں حقیقی اسلام کو بے نقاب کروں جس کی اشاعت رسول اللہ صلعم سے ہوئی۔

(منشی سراج الدین کے نام خط ۔ ۱۹۱۶ء)

تصوف

تصوف کی تمام شاعری مسلمانوں کے پولیٹیکل انحطاط کے زمانہ میں پیدا ہوئی اور ہونا بھی یہی چاہیئے تھا۔ جس قوم میں توانائی مفقود ہو جائے جیسا کہ تاتاری یورش کے بعد مسلمانوں میں مفقود ہو گئی، تو قوم کا نقطۂ نگاہ بدل جاتا ہے۔ ان کے نزدیک ناتوانی ایک حسین و جمیل شے ہو جاتی ہے اور ترکِ دنیا موجبِ تسکین۔ اس ترکِ دنیا کے پردے میں قومیں اپنی سستی، کاہلی اور اس شکست کو جوان کو تنازع اللبقا میں ہو چھپایا کرتی ہیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو دیکھیے کہ ان کے ادبیات کا انتہائی کمال لکھنؤ کی مرثیہ گوئی پر ختم ہوا۔

(سراج الدین پال کے نام خط ۔ ۱۹۱۶ء)

تصوف کا وجود سرزمین اسلام میں ایک اجنبی پودا ہے جس نے عجمیوں کی دماغی آب وہوا میں پرورش پائی ہے۔

(سید سلیمان ندوی کے نام خط ۔ ۱۹۱۷ء)

جب تصوف فلسفہ بننے کی کوشش کرتا ہے اور عجمی اثرات کی وجہ سے نظام عالم کے حقائق اور باری تعالیٰ کی ذات کے متعلق موشگافیاں کر کے کشفی نظریہ پیش کرتا ہے تو میری روح اس کے خلاف بغاوت کرتی ہے۔

(علامہ اسلم جیراجپوری کے نام خط ۔ ۱۹۱۹ء)

ہندی اور ایرانی صوفیا میں سے اکثر نے مسئلہ فنا کی تفسیر فلسفۂ وحدانیت اور بدھ مت کے زیر اثر کی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان اس وقت عملی اعتبار سے ناکارہ محض ہے۔ میرے عقیدے کی رو سے یہ تفسیر بغداد کی تباہی سے بھی زیادہ خطرناک تھی اور ایک معنی میں میری تمام تحریریں اسی تفسیر کے خلاف ایک قسم کی بغاوت ہے۔

(مولوی ظفر احمد صاحب صدیقی کے نام خط ۔ ۱۹۳۶ء)

حقیقت یہ ہے کہ کسی مذہب یا قوم کے دستور العمل و شعار میں باطنی معانی تلاش کرنا یا باطنی مفہوم پیدا کرنا اصل میں اس دستور العمل کو مسخ کر دینا ہے۔ یہ ایک نہایت (SUBTLE) طریقِ تنسیخ کا ہے اور یہ طریق وہی قومیں اختیار یا ایجاد کر سکتی ہیں جن کی فطرت گوسفندی ہو۔ شعرائے عجم میں بیشتر وہ شعراء ہیں جو اپنے فطری میلان کے باعث وجودی فلسفہ کی طرف مائل تھے۔ اسلام سے پہلے بھی ایرانی قوم میں یہ میلانِ طبع موجود تھا اور اگرچہ اسلام نے کچھ عرصہ تک اس کو نشوونما ہونے نہ دیا تاہم وقت پاکر ایران کا آبائی اور طبعی مذاق اچھی طرح ظاہر ہوا۔ یا بالفاظِ دیگر مسلمانوں میں ایک ایسے لٹریچر کی بنیاد پڑی جس کی بنا وحدت الوجود تھی۔ ان شعراء نے نہایت عجیب و غریب اور بظاہر دلفریب طریقوں سے شعائرِ اسلام کی تردید و تنسیخ کی ہے اور اسلام کی ہر محمود شے کو مذموم بیان کیا ہے۔

(سراج الدین پال کے نام خط۔ ۱۹۱۶ء)

ابنِ عربی

تصوف کا سب سے پہلا شاعر عراقی ہے جس نے لمعات میں فصوص الحکم محی الدین ابنِ عربی کی تعلیموں کو نقل کیا ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے، فصوص میں سوائے الحاد و زندقہ کے اور کچھ نہیں۔

(سراج الدین پال کے نام خط۔ ۱۹۱۶ء)

خوئے غلامی

جب انسان میں خوئے غلامی راسخ ہو جاتی ہے تو وہ ہر ایسی تعلیم سے بیزاری کے بہانے تلاش کرتا ہے جس کا مقصد قوتِ نفس اور روحِ انسانی کا ترفع ہو۔

(مولوی ظفر احمد صاحب صدیقی کے نام خط۔ ۱۹۳۶ء)

قرآن کا مسلک

اگرچہ یورپ نے مجھے بدعت کا چسکا ڈال دیا ہے تاہم مسلک میرا وہی ہے جو قرآن کا ہے۔

(سید سلیمان ندوی کے نام خط۔ ۱۹۳۲ء)

شاعری

میرے زیرِ نظر حقائقِ اخلاقی و ملی ہیں۔ زبان میرے لئے ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ بلکہ فنِ شعر سے بھی بحیثیت فن کے نابلد ہوں۔

(پروفیسر شجاع کے نام خط۔ ۱۹۳۱ء)

(باقی ۳۸ پر)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

گلہائے عقیدت

بہ آستانِ عالیہ حضور رسالتمآب (علیہ التحیۃ والسّلام)

بتقریب سعید عید میلاد النبیؐ

ربیع الاول کا مبارک و مسعود مہینہ، اپنی دلنوازشادابیوں اور بصیرت افروز تابانیوں کے ساتھ پھر وجہ تازگی بہارِ عالم ہو رہا ہے اور اس انقلابِ عظیم کی یاد تازہ کرا رہا ہے جو دنیائے قدیم و جدید میں حد فاصل کی حیثیت رکھتا ہے اور ارتقائے انسانیت کے لئے، افق تا افق، نئی نئی راہیں کشادہ کئے چلا جاتا ہے۔ ہم اس عظیم انقلاب کی یاد میں، انسانیت کے محسن اعظمؐ، حضور سرورِ کائنات ؐ کی بارگاہِ عظمت مآب میں، نذرِ عقیدت پیش کرنے کا اس سے بہتر انداز کوئی اور نہیں سمجھتے کہ اس شمعِ عالمتاب کے پروانۂ جاں سوز، مفکرِ قرآن، پرویز صاحب کی مایۂ ناز تصنیف **معراجِ انسانیت** سے چند ایک اقتباسات، زینت اوراقِ طلوعِ اسلام کئے جائیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ قرنِ اوّل سے کر عصرِ حاضر تک حضور نبی اکرمؐ کی سیرتِ مقدسہ کے متعلق ہزارہا کتابیں لکھی گئیں اور ہر ایک نے اپنی اپنی علمی بساط و بصیرت کے مطابق، اس آستانِ عالیہ پر نذرانۂ احترام پیش کیا، لیکن ایسا کہنے میں کچھ مبالغہ نہیں ہوگا کہ ان میں، معراجِ انسانیت کو ایک منفرد خصوصیت حاصل ہے اور وہ یہ کہ اس میں سیرتِ صاحبِ قرآن کو خود قرآن کے آئینے میں پیش کیا گیا ہے اور اس پیش کش میں والہانہ جذبۂ شوق اور مفکرانہ کاوش و تحقیق کا جو حسین امتزاج وجہِ نظر کشی ہوتا ہے، اس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ اسی کانِ جواہر سے چند ایک تابندہ گوہر پیشِ خدمت ہیں۔

(۰)

۱۔ وہ آئے بزم میں

شجرِ زندگی کی ہر شاخ سے نمی خشک ہو چکی تھی۔ تہذیب و تمدن کے پھول وحشت و بربریت کی بادِ سموم سے مرجھا چکے تھے۔ حسنِ عمل کے زندگی بخش چشمے یکسر خشک ہو چکے تھے۔ زمین پر جوہرِ انسانیت کی سرسبزی و شادابی کا کہیں نشان تک باقی نہ تھا۔ کشتِ مذاہب و اخلاق کے حدود تو باقی تھے لیکن فصلیں بالکل اجڑ چکی تھیں۔ اس وحشت و سراسیمگی کے عالم میں 'خاسر و نامراد انسان' ادھر اُدھر مارا مارا پھر رہا تھا لیکن خدا کی اس وسیع زمین پر اسے کہیں زندگی کا نشان اور تازگی کا سراغ نہیں ملتا تھا۔ چاروں طرف سے مایوس و ناامید ہو کر اس کی نگاہیں رہ رہ کر آسمان کی طرف اُٹھتی تھیں اور ایک پکار سننے والے کو پکار پکار کر کہتی تھیں کہ مَتٰی نَصْرُ اللّٰہِ! یہ وقت تھا کہ فطرت کے اٹل قانون کے مطابق افسردگی و پژمردگی کو پھر سے تازگی و شگفتگی میں بدل دیا جاتا۔ چنانچہ اس مقصدِ عظیم کے لئے ربِ ذی المنن کا سحابِ کرم' زندہ امیدوں اور تابندہ آرزوؤں کی ہزار جلتیں اپنے آغوش میں لئے، ربیع الاوّل کے مقدس مہینے میں فاران کی چوٹیوں پر جھوم کر آیا اور بلدِ امین کی مبارک وادیوں میں کھل کھلا کر برسا جس سے انسانیت کی مرجھائی ہوئی کھیتیاں لہلہا اٹھیں۔ اخلاق و تمدن کے پژمردہ پھولوں پر پھر سے بہار آ گئی۔ عمرانیت و مدنیت کے سبزۂ پامال میں نزہت و لطافت پیدا ہو گئی۔ اعمالِ صالحہ کے خشک چشمے حیاتِ تازہ کی جوئے رواں میں تبدیل ہو گئے۔ طغیانی و سرکشی کی بادِ سموم عدل و احسان کی جاں بخش نسیمِ سحری میں بدل گئی۔ فضائے عالم مسرتوں کے نغموں سے گونج اٹھی۔ انسان کو نئی زندگی اور زندگی کو نئے ولولے عطا ہوئے۔ آسمان نے جھک کر زمین کو مبارک باد دی کہ تیرے بختِ بلند نے یاوری کی اور تیرے خوش نصیب ذرّوں کو اس ذاتِ اقدس و اعظم کی پابوسی کی سعادت نصیب ہو گئی جو عالمِ موجودات کے سلسلۂ ارتقا کی آخری کڑی ہے، جس سے شرف و مجدِ انسانیت کی تکمیل ہو گئی۔ جو علم و بصیرت کے اس افقِ اعلیٰ پر جلوہ پا رہے جہاں عقل و عشق، فکر و نظر، دین اور دنیا قوسین کی طرح آپس میں ملتے ہیں، جو دانشِ روحانی اور حکمتِ برہانی کے اس مقامِ بلند پر فائز ہے جہاں غیب و شہود کی وادیاں دامنِ نگاہ میں سمٹ کر آ جاتی ہیں۔ ہاں تو آسمان نے خوش بخت زمین کی بارگاہِ عالیہ میں جھک جھک کر ہدیۂ تبریک و تہنیت پیش کیا، تو ادھر فطرت نے جنت سے نکالے ہوئے آدمؑ کے اس طالعِ بیدار کا تقدیس و تمجید کے زمزموں سے استقبال کیا۔ دنیا سے طاغوتی قوتوں کے تخت الٹ گئے کہ وہ آنے والا آ گیا جس کی آمد ملوکیت و قیصریت کے لئے پیغامِ فنا تھی۔ ایران کے آتشکدوں کی آگ ٹھنڈی پڑ گئی کہ اب انسانی تصورات کی دنیا نار کی جگہ نور سے معمور ہو گئی۔ دنیا کے صنم کدوں کے بت پاش پاش ہو گئے کہ آج مسلکِ ابراہیمیؑ کی تکمیل کا دن آ گیا۔ شیاطین نے پہاڑوں میں جا کر منہ چھپا لیا کہ اب جور و استبداد کی ہر طاغوتی قوت کے روپوش ہونے کا وقت آ گیا۔ دنیا سے باطل

کی تاریکیاں دور ہو گئیں کہ آج اس آفتابِ عالمتاب کا طلوع ہوا جس کے بھیجنے والے نے اسے جگمگاتا چراغ کہہ کر پکارا ــــ اِنَّا اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا وَّ دَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا۔ وہ آنے والا جس کی آمد کا مقصد یہ بتایا گیا کہ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ۔ جب وہ آیا تو اس نے ان تمام اغلال و سلاسل کو ایک ایک کر کے توڑ دیا جن میں انسانیت جکڑی چلی آ رہی تھی۔ احبار و رہبان کی تقلید کے اطواق و سلاسل، قیصر و کسریٰ کے استبداد کی زنجیریں، توہم پرستی کی بصیرت سوز بندشیں، تقسیم انسانیت کے انسانیت کش نسلی، جغرافیائی، وطنی، غیر فطری معیار سب ایک ایک کر کے ٹوٹتے چلے گئے اور پابند قفس، طائرِ لاہوتی کو پھر سے آزادی کی فضائے بسیط میں اذنِ بال کشائی عطا ہوا اور انسان ایک بار پھر زمین پر سر اونچا کر کے چلنے کے قابل ہو گیا۔ انسانیت کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کی سیدھی راہ مل گئی۔ عقل کو عشق کا جنون اور عشق کو عقل کی فرزانگی عطا ہوئی۔ فقر کو شکوہِ خسروی اور پادشاہی کو استغنائے قلندری عنایت ہوا۔ یہ تھی وہ ذاتِ گرامی کہ

محبت از نگاہش پائدار است
سلوکش عشق و مستی را عیار است
مقامش عبدہٗ آمد و لیکن
جہانِ شوق را پروردگار است
اِنَّ ذٰلِكَ لَمُحْيِ الْمَوْتٰى ــــ (۳۰/۵۰)

اس طرح وہ دلوں کی مردہ بستیوں میں پھر سے زندگی کا سامان پیدا کر دیتا ہے۔

۲۔ اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا

جب اشیتِ ایزدی کی تدبیرِ محکم جس کے لئے زمین و آسمان قرنہا قرن سے سرگرداں پھر رہے تھے، اپنی پختگی تک پہنچی جب انسانیت، جس کے لئے کائنات نے ایک ایک ذرّے کو لاکھوں چکر دیئے تھے، گہوارۂ طفولیت سے حریمِ شباب میں آ گئی۔ جب اس صحیفۂ فطرت کی تکمیل کا وقت آ گیا جس کے مختلف اوراق ستاروں کی ٹھنڈی ٹھنڈی مرمریں روشنی میں کوثر و تسنیم سے دھلے ہوئے قلم سے لکھے گئے تھے۔ جب سینۂ کائنات میں اتنی کشادگی پیدا ہو گئی کہ وہ اپنے اندر راز ہائے درونِ پردہ کے معدنِ لعل و گہر کو سمو لے، تو آسمان کی حوریں زمین پر اتریں کہ جنت کے تر و تازہ پھولوں سے وادیٔ بطحاء کی تزئین و آرائش کریں۔ صحنِ گلستانِ کائنات پر بہار آ گئی ہر طرف

سے مسرتوں کے چشمے اُبلنے لگے۔ چاند مسکرایا، ستارے ہنسے، آسمان سے نور کی بارش ہوئی۔ فرشتوں کی معصوم نگاہوں میں اِنِّیْ اَعْلَمُ مَالَا تَعْلَمُوْنَ کی تفسیر ایک پیکرِ محبوبیت کا حسین تصور بن کر چمکنے لگی۔ فلک تعظیم کے لئے جھکا، زمین نے اپنی خاک آلود پیشانی سجدہ سے اٹھائی کہ آج اس کی قرن ہا قرن کی دعاؤں کی قبولیت کا وقت آپہنچا ہے، صحرائے حجاز کے ذرّے جگمگا اٹھے، بلدِ امین کی گلیوں کا نصیبہ جاگا کہ آج اس آنے والے کی آمد آمد تھی جس کی طرف جبلِ تین پر حضرت نوحؑ نے اشارہ کیا تھا اور جسے کوہِ زیتون پر حضرت مسیحؑ نے اپنے حواریوں کو وجہِ تسکینِ خاطر بتایا تھا۔ جس کی آمد کی بشارتیں وادیٔ طورِ سینین میں بنی اسرائیل کو دی گئی تھیں، اور جس کے لئے دشتِ عرب میں حضرت خلیلِ اکبرؑ اور ذبیحِ اعظمؑ نے اپنے خدا کے حضور دامن پھیلایا تھا۔ وہ آنے والا کہ جس کے انتظار میں زمانے نے لاکھوں کروٹیں بدلی تھیں، آیا، اور اس شانِ زیبائی و رعنائی سے آیا کہ زمین و آسمان میں تہنیت کے غلغلے بلند ہوئے۔ فرشتوں نے زمزمۂ تبریک گایا۔ سدرۃ المنتہیٰ کی حدود فراموش شاخوں نے جھولا جھلایا۔ ملاءِ اعلیٰ کی مقدس قندیلوں نے چراغاں کیا۔ کائنات کے ذرّے چمک اُٹھے۔ فضائے عالم صلوٰۃ و سلام کی فردوسِ گوش صداؤں سے گونج اٹھی اور انس و جان وجد و کیف کے عالم میں پکار اٹھے کہ

اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا — اے فروغِ دیدۂ امکاں بیا
در جہانِ ذکر و فکر و انس و جاں — تو صلوٰۃِ صبح، تو بانگِ اذاں

(۰)

۳۔ وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدٰى

طلسمِ نہایتِ آں کہ نہایتے نہ دارد
بہ نگاہِ ناشکیبے بہ دلِ امیدوارے

قلبِ وادیٔ فاران، یعنی ام القریٰ مکہ، اپنی تمام نگاہ فریب جاذبیتوں کے ساتھ، ہر عاکف و باد کے لئے مرکزِ قلب و نظر بنا ہوا ہے۔ چونکہ ریگِ حجاز کے ہر ذرّہ کی عقیدت حریمِ کعبہ کے ساتھ وابستہ ہے اس لئے فلک و برنا و پیر، نزد و دور، کارواں در کارواں اپنی پیشانیوں میں تڑپتے ہوئے سجدوں کے نذرانے لئے، رواں دواں اور کشاں کشاں اس مرجعِ انام کی طرف چلے آرہے ہیں۔ جبینِ شوق سجدوں سے معمور ہے لیکن کچھ معلوم نہیں کہ سجود کیا ہے؟ قلبِ نیاز جذبہ ہائے عقیدت سے لبریز ہے لیکن کوئی نہیں جانتا کہ معبود کون ہے؟ زندگی کی تگ و تاز بہر نوع ہنگامہ خیز ہے لیکن کسی کو علم نہیں کہ اس تگ و تاز سے مقصود کیا ہے؟ کاروانِ حیات تیز گام ہے لیکن کوئی نہیں جانتا کہ اس کی منزل کونسی ہے؟ لیکن اس نہ جاننے کے باوجود ایک ہنگامہ ہے کہ ہر وقت برپا ہے جس

ہیں ہر شخص اپنے آپ کو جذب کئے ہوئے ہے۔ اس کیف و مستی کے عالم میں کوئی تالیاں پیٹتا ہے، کوئی سیٹیاں بجاتا ہے۔ کوئی کعبے کے گرد گھوم گھوم کر، سفر ختم ہو جانے کے باوجود ذوقِ سفر کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ کوئی بتوں کے آستانوں پر جانور ذبح کر کے ان کا گرم گرم لہو پی رہا ہے۔ کوئی زمزم کے کنارے بیٹھا جام و سبو کے امتیازات مٹا رہا ہے۔ کاہنوں کے گرد عورتوں کا ہجوم ہے، جو اپنے صبر گریز پا اور رنج گراں نشیں کے جگر سوز افسانوں کا مستقبل معلوم کرنا چاہتی ہیں۔ ادھر عکاظ کے بازار میں شعرائے جادو بیاں اپنی سحر آفرینیوں سے ہر سننے والے کے دل کو مٹھی میں لئے ہوتے ہیں۔ کبھی کسی کے خاندانی مفاخر کے تذکرے سے اس کے طرۂ امتیاز بالیدگی پیدا کرتے ہیں اور کبھی کسی کے عزیز کے قتل کی یاد تازہ کر کے اس کی رگوں میں آتشِ انتقام کے شعلے اس طرح بھڑکاتے ہیں کہ بزم شعر خوانی آن کی آن میں رزم گاہ بن جاتی ہے۔ لیکن محفلِ عیش و طرب ہے یا میدان جنگ و جدل ہر شخص پورے جذبۂ انہماک سے اس میں حصہ لیتا ہے اور اس ہمہمہ اور طنطنہ میں دنیا و مافیہا سے بے خبر یوں مستغرق ہو جاتا ہے کہ کوئی کشش اسے اس ہنگامے سے باہر نہیں لے جا سکتی۔ چھوٹا بڑا، امیر غریب مرد، عورت سب ان ہنگاموں میں اس طرح شریک ہوتے ہیں گویا یہ چیزیں ان کی زندگی کا جزو بن چکی ہیں۔

ایک استثناء

لیکن مکہ کی ان پر ہجوم گلیوں میں ایک ایسا شخص بھی دکھائی دیتا ہے جو ان میں سے ہوتے ہوئے بھی ان میں کا معلوم نہیں ہوتا۔ اس کی طرزِ معاشرت، وضع قطع، تراش خراش سب انہی جیسی ہے۔ وہ انہی بازاروں میں پھرتا ہے، انہی لوگوں کے سے کاروبار کرتا ہے۔ ان کی شادی اور غم میں شریک ہوتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو انہی جیسا انسان سمجھتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنی زندگی میں کوئی خلا محسوس کرتا ہے۔ اور نہیں جانتا ہے کہ وہ خلا کیا ہے؟ اور کس طرح پُر ہو سکتا ہے۔ وہ مشاغل و مشارب جو اس کی قوم کا جزو زندگی بن چکے ہیں اس کے لئے اپنے اندر کوئی جاذبیت نہیں رکھتے۔ وہ بھی اپنی جبینِ نیاز میں ذوقِ عبودیت کے سجود لے کر حریمِ کعبہ تک جاتا ہے لیکن وہ ان گہرہائے تابندہ کو اسی طرح واپس لے آتا ہے کہ اسے وہاں انسانوں کی بنائی ہوئی چوکھٹیں اس متاعِ گراں بہا کے شایانِ شان دکھائی نہیں دیتیں۔ وہ جب لوگوں کی گردنوں کو ان کے اپنے ہاتھوں کی بنائی ہوئی مٹی اور پتھر کی مورتیوں کے سامنے جھکا ہوا دیکھتا ہے، تو وہ محو حیرت رہ جاتا ہے کہ — یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟ وہ عکاظ کے بازار میں جب سردارانِ قریش کو اپنی عالی نسبی پر فخر کرتے دیکھتا ہے تو، ہر چند وہ خود قریش کے ممتاز ترین گھرانے کا فرد ہے، لیکن اس کا دل گواہی نہیں دیتا کہ جس چیز میں انسان کے اپنے جوہرِ ذاتی کا کوئی دخل نہ ہو وہ باعثِ فخر و تکبر بھی ہو سکتی ہے۔ وہ بزم مے پرستی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا کہ اس سے اس کا قلبِ سلیم ابا کرتا ہے۔ وہ قمار خانوں کی طرف قدم نہیں اٹھاتا کہ وہاں اسے مہذب انسانوں کے بھیس میں رہزن دکھائی دیتے ہیں۔

تلاشِ حقیقت

وہ جب ان محافل و مجالس میں اپنے لئے کوئی سامانِ تسکین نہیں پاتا تو عیسائی رہبان اور یہودی احبار کیطرف رجوع کرتا ہے کہ اس نے سن رکھا ہے کہ وہ زندگی کے حقائق کا علم رکھنے کے مدعی ہیں۔ وہ خود لکھنا پڑھنا نہیں جانتا اس لئے ان علماء و مشائخ سے پوچھتا ہے کہ ان کے پاس کونسی روشنی ہے جسے وہ آسمانی کہہ کر پکارتے ہیں۔ لیکن اسے ان مزعومہ آسمانی شمعوں پر انسانی تصورات کے ایسے ایسے رنگین فانوس نظر آتے ہیں جنہوں نے شمع کی اصلی روشنی کو بالکل ڈھانپ رکھا ہے۔ وہ یہاں سے بھی ٹھنڈی آہ بھر کر اٹھ آتا ہے۔ اسے معلوم ہوتا ہے کہ انہی بستیوں میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو اس کی طرح ان معبودانِ باطل سے متنفر ہیں۔ وہ ان کی طرف رُخ کرتا ہے کہ شاید وہیں وہ سکون مل جائے جس کی اُسے تلاش ہے۔ لیکن اُسے ان کا ذوق بھی نشہ اور تڑپ خام نظر آتی ہے۔ وہ وہاں سے بھی مایوس واپس آجاتا ہے۔ غرضیکہ وہ انسانوں کے اس ہجوم میں اپنے آپ کو تنہا پاتا ہے۔ اسے کوئی ایسا رفیق نہیں ملتا جس سے اپنے دل کی تپش و غلش اور سوز و گداز کا حال کہہ سکے۔ وہ اس تنہائی سے اکتا جاتا ہے تو آسمان کی طرف آنکھ اٹھا کر پکار اٹھتا ہے کہ ؎

دریں میخانہ اے ساقی ندارم محرمے دیگر
کہ من شاید نشستیں آدمم از عالمے دیگر

تفکر و تدبر

وہ انسانوں کی بستیوں میں اپنے دل کی پکار کا کوئی جواب نہیں پاتا تو باہر فطرت کی کھلی فضاؤں میں چلا جاتا ہے۔ وہاں کبھی صحراؤں کی ناپیدا کنار وسعتوں پر غور کرتا ہے اور کبھی آسمانوں کی حدود فراموش پہنائیوں پر۔ کبھی اُسے ستاروں کی تابندگی دعوتِ غور و فکر دیتی ہے اور کبھی ماہ عالمتاب کی درخشندگی اس کے لئے سامانِ تدبر پیدا کرتی ہے۔ وہ مظاہرِ فطرت کی گوناگوں نیرنگیوں پر غور کرتا اور بار بار اپنے دل سے سوال کرتا ہے کہ یہ عظیم الشان سلسلۂ کائنات کس طرح وجود میں آگیا؟ کون اسے بایں حسن و خوبی چلا رہا ہے؟ اسکا بالآخر مقصد کیا ہے؟ یہ سوالات رہ رہ کر اس کے دل میں پیدا ہوتے ہیں لیکن اسے ان کا جواب کہیں سے نہیں ملتا۔ جب جواب نہیں ملتا تو اس سے اس کے دل کا اضطراب اور بڑھ جاتا ہے۔ اور جب اضطراب بڑھتا ہے تو اس کے ساتھ ہی تشنگیٔ ذوق کی شدت تیز سے تیز تر ہو جاتی ہے۔ لیکن اسے اپنے آپ پر ضبط اتنا ہے کہ وہ اس کاوشِ اضطراب کو اپنے معمولاتِ زندگی پر قطعاً اثر انداز نہیں ہونے دیتا۔ وہ اپنے کاروباری معاملات، بال بچوں کی نگہ و پرداخت، رفقا و احباب سے میل ملاقات۔ معاشرتی زندگی کے مقتضیات میں کوئی فرق نہیں آنے دیتا اور ایسی زندگی بسر کئے جاتا ہے کہ اس کے ابنائے جنس اپنے میں اور اس میں کوئی فرق محسوس نہیں کرتے بجز اس کے کہ وہ اس کے کیریکٹر کی بلندی کے مداح ہیں۔ اور اس کی صداقت و دیانت کے معترف۔ چھوٹا بڑا سب اس کی عزت کرتے ہیں۔ قبیلہ اور خاندان کو اس کی شرافت و نجابت پر ناز ہے۔ لیکن وہ اپنے آپ کو ان سے کچھ مختلف محسوس کرتا ہے۔

اس لئے کہ جن گوشوں کو انہوں نے اپنے لئے وجہِ اطمینان اور موجبِ تسکین قرار دے رکھا ہے وہ ان میں سے کسی میں بھی اپنے دل کے اضطراب کا مداوا نہیں پاتا۔ وہ اپنے آپ کو ہر وقت کسی ایسی چیز کی تلاش میں مضطرب و بے قرار پاتا ہے جس کا اُسے خود بھی علم نہیں کہ وہ کیا ہے!

قرآنِ کریم نے حضورؐ کی تلاشِ حقیقت میں سرگردانی کی اس کیفیت کو دو لفظوں میں سمیٹ کر رکھ دیا ہے جب فرمایا ہے کہ

وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى (۹۳/۷)

ہم نے تجھے تلاشِ حقیقت میں سرگرداں پایا تو راستہ دکھا دیا۔

کارلائل نے اسی حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

"شروع ہی سے چلتے پھرتے آپ کے دل میں ہزاروں سوالات پیدا ہوتے تھے۔

میں کیا ہوں؟

کائنات کا لامتناہی سلسلہ کیا ہے؟

زندگی کیا ہے؟

موت کیا ہے؟

مجھے کس چیز پہ ایمان رکھنا چاہیئے؟

مجھے کیا کرنا چاہیئے؟

حرا اور فاران کی پہاڑیاں، ریت کے ٹیلوں کا سکوت، ان سوالات کا کوئی جواب نہیں دیتے تھے آسمان اور اس کے درخشاں ستارے بھی مہر بلب تھے۔ ان سوالات کا جواب کہیں سے نہیں ملتا تھا۔ ان سوالات کا جواب انسان کی اپنی روح اور خدا کی اس وحی سے ملتا تھا جو اس روح کو اپنا مسکن بنا لے۔"

(HEROES AND HEROE — WORSHIP P. 49)

ہاں! ان سوالات کا جواب کہیں سے نہیں مل سکتا تھا۔ ان کا جواب صرف وحی کی زبان سے مل سکتا تھا۔ حقیقت کا انکشاف ناممکن ہے جب تک حقیقت خود اپنے آپ کو کسی پر منکشف نہ کرے۔ مسائلِ حیات نہیں سمجھے جا سکتے جب تک "حیات" خود ہی "شارحِ حیات" نہ ہو جائے۔ حقیقت کے مشاہدہ کے لئے انسان کی آنکھ وحی کی روشنی کی محتاج ہے۔ اور نبی قبل از نبوت وحی سے واقف نہیں ہوتا۔ یہی کیفیت قبل از رسالت حضورؐ کی تھی۔

اس کے بعد حضورؐ شرفِ نبوت سے سرفراز فرمائے گئے۔

۴۔ مقامِ محمدیؐ

یہ آنے والا رسول کافۃً للناس اور رحمۃ للعالمینؐ بن کر آیا اور اپنے ساتھ وہ نظامِ عدل و حریت لایا جو انسان کو دنیا بھر کی غلامی سے آزادی دلانے کا کفیل تھا۔ یہ پیغام کوئی انوکھا پیغام اور یہ تعلیم کوئی نئی تعلیم نہ تھی صداقت جہاں کہیں بھی تھی اسی کتابِ مبین کا کوئی نہ کوئی ورق تھی جو حضورؐ کی وساطت سے دنیا کو ملی۔ روشنی جس مقام پر بھی تھی وہ اسی قندیلِ آسمانی کی کوئی نہ کوئی کرن تھی جو قلبِ محمدیؐ میں اتاری گئی ۔ مشامِ جان نے جہاں کہیں بھی عطر بیزی و عنبر فشانی کی وہ لالہ و یاسمین کی انہی پتیوں کی رہینِ منت تھی جن کا گلدستہ اس نبی آخر الزمانؐ کے مقدس ہاتھوں محرابِ کعبہ میں رکھا گیا۔

پیغامِ محمدیؐ کیا ہے ؟ انہی اوراق کی شیرازہ بندی جنہیں حوادثِ ارضی و سماوی کی آندھی کے تیز جھونکوں نے صحنِ کائنات میں اِدھر اُدھر بکھیر دیا تھا۔ اور

مقامِ محمدیؐ کیا ہے ؟

انہی درخشندہ و تابندہ قماشِ نادرہ کا پیکرِ حسن و زیبائی جن کی حقیقی آب و تاب کو ان کے ستائش گروں کی غلو آمیز عقیدت کی رنگینیوں نے مستور کر رکھا تھا۔ وہاں یہ جوہر الگ الگ پڑے تھے، یہاں یہ پیکرِ جلال و جمال ان سب کا حسین مجموعہ تھا۔ وہاں یہ الفاظ بکھرے ہوئے تھے، یہاں یہ ایک ایسے عدیم النظیر مصرعہ میں آب و تاب سے موزوں ہو گئے تھے جو ضمیرِ کائنات میں قرنہا قرن سے پہلو بدل رہا تھا۔ وہ موتی تھے، یہ مالا تھی۔ وہ پتیاں تھیں، یہ پھول تھا۔ وہ ذرے تھے، یہ چٹان تھی۔ وہ قطرے تھے یہ سمندر تھا۔ وہ ستارے تھے، یہ کہکشاں تھی۔ وہ افراد تھے، یہ ملت تھی۔ وہ نقطے تھے یہ خطِ مستقیم تھا۔ وہ ابتدا تھی، یہ انتہا تھا۔

خلق و تقدیر و ہدایت ابتدا است
رحمت للعالمینی انتہا است

خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا آخری مرتبہ کہہ دیا۔ شرفِ انسانیت کی تکمیل کے لئے جو قوانین دیئے جانے تھے وہ اپنی انتہائی شکل میں دے دیئے گئے۔ اس کے بعد انسان کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے کسی دوسری مشعلِ راہ کی ضرورت اور کسی اور ہادی طریقت کی احتیاج نہ رہی۔ اب انسانیت کے مقامِ بلند تک پہنچنے کے لئے وہی ایک صراطِ مستقیم ہے جس پر اس ذاتِ اقدس و اعظمؐ کے نقوشِ قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور جنہیں دیکھ کر ہر دیدہ ور پکار اٹھتا ہے کہ

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق دل بند و راہِ مصطفےٰؐ رو

(۱)

۵۔ ہجرت

(نبوت کے تیرہ سال بعد)

(مدینہ کی طرف تشریف آوری)

تین شب و روز حضورؐ نے اپنے "یارِ غار" کے ساتھ یہیں بسر کئے۔ چوتھی شب حضرت ابوبکرؓ کے گھر سے سواری کی اونٹنیاں آگئیں اور آپ آگے روانہ ہو گئے۔ مدینہ میں اطلاع پہنچ چکی تھی کہ آپؐ نے مکہ چھوڑ دیا ہے۔ تمام انصارؓ وفورِ شوق و جذبۂ محبت سے سرشار صبح نور کے تڑکے بستی سے باہر آکر دیدہ و دل فرشِ راہ کئے انتظار میں بیٹھ جاتے۔ ہر روز صبح یہی کیفیت رہتی۔

دشمن سامنے

قریش نے آپؐ کی گرفتاری کا پہ سو اونٹوں کا انعام مشتہر کر رکھا تھا۔ بریدہ اسلمی، ایک قبیلہ کا سردار اس انعام کے لالچ سے حضورؐ کی تلاش میں نکلا۔ حضورؐ کو راہ میں پا لیا جب سامنے آیا اور ہمکلام ہوا تو اثر و جذب کا ایک تیر تھا جو سویدِ ہادی تک اتر گیا اور اپنی قوم کے ستر آدمیوں سمیت مسلمان ہو گیا۔ جوشِ مسرت سے اپنی سفید پگڑی نیزہ پر باندھ کر اس کاروانِ رشد و سعادت کے آگے آگے چل پڑا۔ پگڑی کا پھریرا ہوا میں لہراتا اور رقص انگیز انداز سے بشارتیں سناتا چلا جا رہا تھا کہ "امن کا بادشاہ، صلح کا حامی، دنیا کو انصاف و عدالت سے بھرپور کر دینے والا" آرہا ہے۔ اس طرح رواں دواں، نور و نکہت کی ہزار دنیائیں اپنے جلو میں لئے، یہ قافلۂ جذب و شوق سرورِ مدینہ کی طرف بڑھتا گیا۔ اور ۸ ربیع الاول (۲۳ ستمبر) کی صبح مدینہ منورہ کے قریب جا پہنچا۔ مشتاقین کی

مدینہ میں تشریف آوری

جماعت حسبِ معمول انتظار کے بعد واپس لوٹ چکی تھی۔ ایک یہودی نے دور سے دیکھا تو قرائن و آثار سے معلوم کر لیا کہ وہی قافلہ ہے جس کے انتظار میں اتنے دنوں سے انصار کی آنکھیں فرشِ راہ بن رہی تھیں۔ اس نے آواز دی کہ "اہلِ عرب۔ لو جس کا تم انتظار کر رہے تھے وہ آگیا۔" تمام شہر اللہ اکبر کے نعروں سے گونج اٹھا اور انصار ہتھیار سج سج کر بیتابانہ گھروں سے نکل آئے اور پروانہ وار اس آواز کی طرف بڑھے۔ مدینہ سے تین میل کے فاصلہ پر انصار کے کچھ خاندان آباد تھے۔ اس بستی کو قبا کہتے ہیں۔ حضورؐ یہاں پہنچے تو تمام خاندانوں نے جوشِ مسرت سے نعرہ ہائے تکبیر بلند کئے۔ ان کے مقدر نے یاوری کی اور حضورؐ نے ان کی میزبانی قبول فرمالی۔ یہاں سب سے پہلا کام مسجد کا تعمیر کرنا تھا اس لئے کہ نظامِ خداوندی کا مرکز ہوتی ہی مسجد ہے۔ یہ مسجد قبا تھی۔ چودہ دن کے بعد آپ شہر کی طرف روانہ ہوئے۔ راہ میں بنی سالم کے محلہ میں جمعہ کی نماز ادا فرمائی۔ یہ اس سرزمین میں جسے حکومتِ خداوندی کا گہوارہ بننا تھا، جماعتِ مومنین کا پہلا اجتماع تھا کس قدر حسین تھی یہ ابتداء۔ قبا سے مدینہ تک راستہ میں دو رویہ فدائیوں کی صفیں تھیں۔ سارا شہر جوشِ مسرت اور تشکر و عقیدت سے معمورہ جذب و نشاط اور گہوارۂ حسن و بہار بن رہا تھا۔ گلی کوچوں سے

خدا کی حمد و ستائش کے نغمے اور تشکر و امتنان کے زمزمے ساری فضا کو کیف بار اور مسرت بیز بنا رہے تھے۔ جوشِ استقبال سے قلوب کے ساغر اس طرح بے محابا چھلک رہے تھے کہ صہبائے محبت مسرت و ابتہاج کے نورانی آنسوؤں کی شکل میں دامان و آستیں کو صحنِ گلستان و کفِ باغباں بنا رہی تھی۔ کہیں جبین ہائے نیاز بحضورِ ربِ ذوالمنن سجدہ ریز و زمین بوس تھیں اور کہیں ہجومِ جذبات سے مرتعش ہاتھ تھے کہ بارگاہِ صمدیت میں اس مہمانِ عزیز کی خیر سگالی اور خوش بختی کی حسین دعائیں اور معصوم التجائیں لئے یوں جانبِ عرشِ عظیم اٹھ رہے تھے جیسے خاموش صحرا میں نخیلِ بلند ایستادہ ہوں۔ خاکِ یثرب کے ذرات ابھر ابھر کر ہمہ تن دیدبن رہے تھے کہ انہیں آج اس ذاتِ اقدس و اعظم کی کفش بوسی کی سعادت نصیب ہونے والی تھی جو تمام عالم کے لئے سرمایۂ فخر و ناز تھی۔ چھوٹی چھوٹی لڑکیاں جوشِ مسرت میں دف بجاتیں اور یہ استقبالیہ نغمہ گا رہی تھیں کہ

طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَيْنَا
مِنْ ثَنِيَّاتِ الْوَدَاعِ
وَجَبَ الشُّكْرُ عَلَيْنَا
مَا دَاعَ لِلّٰهِ دَاعِ

خلوص و محبت کے ان روح پرور نظاروں میں یہ کاروانِ حسن و خوبی یثرب کی بستی میں داخل ہوا جس کا نام اس کے بعد مدینۃ النبیؐ ہو گیا۔

(۰)

۶۔ حسنِ سیرت کی رعنائیاں

حیاتِ نبویؐ کی کتابِ مقدس کے تیئیس اوراق پیچھے کو الٹیئے اور ایک طائرانہ نگہ بازگشت ڈالئے ان تمام احوال و ظروف پر اور کوائف و حوادث پر جو اس داستانِ اطہر و اقدس کے اجزاء و عناصر ہیں۔ دیکھئے اور غور کیجئے کہ اس پوری داستانِ حیات میں کس طرح زندگی اپنی انتہائی تابناکیوں اور ضو فشانیوں، سرگرمیوں اور حرارت آفرینیوں، جمال آفرینیوں اور جلال انگیزیوں، سیرابیوں اور شادابیوں، کامرانیوں اور کامجوئیوں، ناپیدا کنار وسعتوں اور بے پایاں گہرائیوں کے ساتھ مصروفِ عمل نظر آتی ہے۔ زندگی کیا ہے؟ ایک کاروانِ ذوق و شوق ہے جو یقینِ کامل اور ایمانِ محکم، حسنِ عمل اور جوششِ کردار، تطہیرِ فکر اور پاکیزگیٔ نگاہ، کشادہ ظرفی اور بلند بینی، سوز و ساز اور تپش و خلش کی ایک دنیا اپنے جلو میں لئے انتہائی جذب و انہماک کے ساتھ، این و آن کی دامن کشیوں سے بے خبر اور گرد و پیش کی عناں گیریوں سے بے نیاز، اپنی منتہیٰ منزل کی طرف مستانہ وار بڑھے چلا جا رہا ہے۔ راستے کے

خطرات اس کے دل میں خوف و ہراس پیدا کرتے ہیں، نہ سفر کی صعوبات اس کے پائے استقامت میں لغزش کے آثار نمودار کرتی ہیں۔ گوئٹے کے الفاظ میں، یہ زندگی نہیں، ایک جوئے رواں ہے کہ نامساعدتِ حالات و ناموافقتِ زمانہ کی ہر چٹان اس کی رفتار میں اور تیزی اور اس کی موجوں میں مزید جوش خرامی پیدا کر دیتی ہے۔

ہنگر کہ جوئے آب چہ مستانہ می رود — مانند کہکشاں بگریبانِ مرغزار
در خواب ناز بود بہ گہوارۂ سحاب — واکرد چشم شوق بآغوشِ کوہسار
از سنگ ریزہ نغمہ کشاید خرامِ او — بیمائے او چوں آئینۂ بے زنگ و بے غبار

زی بحر بیکرانہ چہ مستانہ می رود
در خود یگانہ، از ہمہ بے گانہ می رود

یہ جوئے رواں نہ صرف ہجومِ تزاحم اور انبوہِ تصادم کی سنگلاخ زمینوں ہی سے مستانہ وار گزرتی آئی ہے بلکہ کشش و جاذبیت کی ہر وادی رنگ و تعطر اور امیال و عواطف کے ہر دامنِ کیف و نکہت پر ایک تبسم آلود نگاہ ڈالتی کج کلہانہ انداز سے آگے بڑھتی چلی آئی ہے۔

در راہِ او بہار پرنیانہ آفرید — نرگس دمید و لالہ دمید و سمن دمید
گل عشوہ داد و گفت یکے پیشِ ما بایست — خندید غنچہ و سر دامانِ او کشید
ناآشنائے جلوہ فروشانِ سبز پوش — صحرا برید و سینۂ کوہ و کمر درید

زی بحر بیکرانہ چہ مستانہ می رود
در خود یگانہ، از ہمہ بے گانہ می رود

(۰)

گہرہائے تابدار

(چند احادیثِ مقدسہ جو طلوعِ اسلام کے مائیل پر وقتاً فوقتاً شائع ہوتی ہیں)

رسول اللہ نے وفات کے وقت کچھ نہیں چھوڑا۔ نہ درہم نہ دینار۔ نہ غلام نہ لونڈی، نہ کوئی اور شے۔ صرف اپنا سفید خچر اور ہتھیار۔ اور کچھ زمین جسے عام مسلمانوں کے لئے چھوڑ دیا۔

(بخاری)

رسول اللہ نے فرمایا — ہمارا کوئی وارث نہیں۔ جو چھوڑا ہے وہ عام مسلمانوں کیلئے ہے۔ (بخاری)

○ حضرت علیؓ کی روایت ہے کہ ---- رسول اللہ نے فرمایا کہ
خبردار فتنہ واقع ہوگا۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ اس سے کیونکر نجات ہوگی؟ آپ نے فرمایا کہ کتاب اللہ (پر عمل کرنے) سے۔ جس میں تمہارے درمیان (حرام و حلال یا طاعت و گناہ وغیرہ کا) حکم ہے۔ اور حق و باطل کے اندر قول فیصل ہے۔ جس متکبر نے قرآن کو چھوڑا ہلاک کرے گا اس کو اللہ۔ جس نے قرآن کی طرف لوگوں کو بلایا... اس کو سیدھی راہ دکھائی گئی۔

(مشکوٰۃ بحوالہ ترمذی۔ دارمی)

○ رسول اللہ نے فرمایا کہ میرے بعد تم سے بہت سی احادیث بیان کی جائیں گی۔ سو جب کوئی حدیث میری طرف سے بیان کی جائے تو اسے کتاب اللہ کے سامنے پیش کرو۔ جو اس کے موافق ہو اسے قبول کرلو۔ جو اس کے خلاف ہو اسے رد کردو۔ (بحوالہ کتاب التوضیح والتلویح صفحہ ۴۸۰)

○ رسول اللہ نے فرمایا کہ زمین اللہ کی ہے اور بندے بھی اللہ ہی کے ہیں۔ اس لئے زمین اللہ کے بندوں کے لئے رہنی چاہیئے کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہونی چاہیئے۔ (کتاب الاموال)

○ (امام بخاریؒ) عبدالعزیز بن رفیعؓ سے روایت کرتے ہیں کہ میں اور شداد بن معقلؓ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ پھر شداد بن معقل نے ان سے دریافت کیا۔ "کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی چیز چھوڑی تھی؟" انہوں نے جواب دیا "آپ نے ما بین الدفتین (یعنی مجلد قرآن مجید) کے علاوہ کچھ نہیں چھوڑا"۔ عبدالعزیز بن رفیعؓ کہتے ہیں کہ پھر ہم دونوں محمد بن الحنفیہؓ کی خدمت میں پہنچے۔ اور ان سے بھی یہی بات دریافت کی۔ انہوں نے کہا "آپ نے ما بین الدفتین کے علاوہ کچھ بھی نہیں چھوڑا"۔

(صحیح البخاری۔ جلد سوم صفحہ ۲۳۴۔ مطبوعہ جمعیۃ مصریہ)

○ رسول اللہ نے فرمایا --- میرے ورثاء میں ایک دینار بھی بطور ترکہ تقسیم نہ ہوگا۔ میری بیویوں کی ضروریات اور منتظم کی خوراک کے بعد جو کچھ بھی بچے وہ صدقہ ہوگا۔ (بخاری جلد ۴۔ کتاب الفرائض)

○ رسول اللہ نے اپنے آخری حج کے خطبہ میں فرمایا --- میں تم میں ایک ایسی چیز چھوڑے جاتا ہوں جس سے اگر تم وابستہ رہے تو کبھی گمراہ نہیں ہوگے --- وہ چیز کتاب اللہ ہے۔

(مسلم۔ نسائی۔ ابوداؤد)

○ حضرت ابو موسیٰؓ سے روایت ہے کہ اشعر کے قبیلہ والوں کے ہاں یہ دستور تھا کہ جب کسی جنگ میں ان کے پاس کھانا تھوڑا رہ جاتا یا مدینہ میں ان کے بال بچوں پر فاقہ کی نوبت آجاتی تو یہ لوگ سب اپنے اپنے کھانوں کی چیزوں کو ایک جگہ جمع کرلیتے۔ اور ایک برتن میں برابر حصے لگا کر آپس میں تقسیم کرلیتے۔

رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ یہ لوگ مجھ سے ہیں اور میں ان میں سے ہوں۔ (بخاری مسلم)

○ حضرت ابوسعید خدری رضؓ سے روایت ہے کہ ہم رسولؐ اللہ کے ساتھ سفر میں تھے۔ ایک شخص آیا اور دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ آپؐ نے فرمایا۔ جس کے پاس سواری ضرورت سے زیادہ ہو وہ اس شخص کو دے دے۔ جسے اس کی ضرورت ہو جس کے پاس زادِ راہ ضرورت سے زیادہ ہو وہ اسے دے دے جس کے پاس نہ ہو۔ اس طرح آپؐ نے بہت سی چیزوں کا ذکر فرمایا۔ حتیٰ کہ ہم نے سمجھ لیا کہ ہم میں سے کسی کو ضرورت سے زیادہ کوئی چیز رکھنے کا حق نہیں۔

(مسلم بحوالہ ریاض الصالحین امام نوویؒ)

○ رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ اگر تم پر کوئی ایسا حبشی غلام بھی، جس کا سر کشمش کی طرح چھوٹا ہو، امیر بنا دیا جائے، تو جب تک وہ کتاب اللہ کے مطابق چلائے اس کی سنو اور اس کی اطاعت کرو۔ (بخاری)

○ فرمایا کہ مجھ سے (قرآن کے علاوہ) کوئی بات نہ لکھو اور جس نے قرآن کے علاوہ کچھ اور لکھ لیا ہو وہ اسے مٹا ڈالے۔ (مسلم)

○ حضورؐ نبی اکرم نے فرمایا کہ جس بستی میں کسی شخص نے اس حال میں صبح کی کہ وہ رات بھر بھوکا رہا۔ اس بستی کی حفاظت و نگرانی کا ذمہ ختم ہو گیا۔ (مسند امام احمد)

○ حضرت رافع بن خدیج رضؓ راوی ہیں کہ انہوں نے ایک کھیت میں کاشت کر رکھی تھی کہ ادھر سے رسولؐ اللہ کا گزر ہوا۔ میں کھیت میں پانی دے رہا تھا۔ حضورؐ نے دریافت فرمایا کہ زمین کس کی ہے اور اس میں کاشت کون کرتا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ بیج بھی میں ڈالتا ہوں اور کاشت بھی میں کرتا ہوں لیکن زمین فلاں کی ہے اس لئے پیداوار کا ایک حصہ وہ لے جاتا ہے اور ایک حصہ میرا ہوتا ہے۔ اس پر آپؐ نے فرمایا کہ تم دونوں سودی کاروبار کرتے ہو۔

(ابوداؤد۔ کتاب البیوع)

○ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ وہ حضرت عائشہ رضؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اے ام المومنینؓ! ایک شخص رات کو زیادہ سوتا ہے اور کم عبادت کرتا ہے۔ دوسرا زیادہ عبادت کرتا ہے اور کم سوتا ہے۔ آپ کے نزدیک دونوں میں سے کونسا زیادہ پسندیدہ ہے۔

حضرت عائشہ رضؓ نے فرمایا کہ میں نے ایک دفعہ ایسا ہی سوال رسولؐ اللہ سے کیا تھا تو آپؐ نے فرمایا تھا کہ ان میں سے جو زیادہ عقلمند ہے وہ۔ میں نے عرض کیا، یا رسولؐ اللہ! میں نے تو ان کی عبادت کے متعلق پوچھا تھا۔ آپؐ نے فرمایا۔ عائشہ رضؓ! ان کی عقلوں کے متعلق سوال ہوگا۔ پھر جو شخص زیادہ

عقلمند ہوگا وہی دنیا اور آخرت میں افضل ہوگا۔ (کتاب الاذکیا۔ ابن جوزی)

- رسولؐ اللہ نے ایک دن صحابہؓ سے فرمایا کہ کیا میں تمہیں ایک ایسی چیز بتاؤں جو نماز، روزہ اور زکوٰۃ سے بھی افضل ہے صحابہؓ نے اشتیاق کے ساتھ پوچھا تو آپؐ نے فرمایا

باہمی تعلقات کا درست رکھنا۔ (ابوداؤد)

- رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ کچھ لوگ کشتی میں سوار ہوئے۔ ان میں سے کچھ اوپر کے حصے میں پہنچ گئے اور کچھ نچلے حصے میں رہے۔ جو نچلے حصے میں تھے وہ پانی لینے کے لئے اوپر گئے تو اوپر والوں نے انہیں یہ کہہ کر پانی لینے سے روک دیا کہ اس سے انہیں تکلیف ہوتی ہے۔ نیچے والوں نے کہا کہ بہت اچھا۔ ہم نیچے سوراخ کر کے پانی لے لیں گے۔ اب اگر نیچے والوں کو پانی دے کر اس سے روکا نہ جائے تو ظاہر ہے کہ نیچے اور اوپر والے سب غرق ہو جائیں گے۔ اگر انہیں پانی دے دیا جائے تو سب بچ جائینگے۔

(ترمذی۔ باب الفتن)

(بشکریہ)

بقیہ .... درِ منثور .... صفحہ ۲۲ سے آگے

شاعری میں لٹریچر بحیثیت لٹریچر کبھی میرا مطمع نظر نہیں رہا۔ مقصود صرف یہ ہے کہ خیالات میں انقلاب پیدا ہو اور بس۔ اس بات کو مدنظر رکھ کر جن خیالات کو مفید سمجھتا ہوں ان کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ کیا عجب کہ آئندہ نسلیں مجھے شاعر تصور نہ کریں۔ (سید سلیمان ندوی کے نام خط۔ ۱۹۱۹ء)

میں نے کبھی اپنے آپ کو شاعر نہیں سمجھا۔ اس واسطے میرا کوئی رقیب نہیں۔ اور نہ میں کسی کو اپنا رقیب تصور کرتا ہوں۔ فنِ شاعری سے مجھے کبھی دلچسپی نہیں رہی۔ ہاں بعض مقاصد خاص رکھتا ہوں جن کے بیان کے لئے ملک کے حالات و روایات کی رُو سے میں نے نظم کا طریقہ اختیار کر لیا ہے۔ ورنہ

نہ بینی خیر ازاں مرد فرودست — کہ برمن تہمت شعر و سخن بست

(سید سلیمان ندوی کے نام خط۔ ۱۹۳۷ء)

(بشکریہ)

معراجِ انسانیت

پرویز

سیرتِ صاحبِ قرآن؛ خود قرآن کے آئینے میں

حسنِ سیرت کی رعنائیاں، خالقِ حسن کی نگاہ میں

★ سیرتِ طیبہ کے ہر گوشے کا عنوان قرآنی آیات اور اس کی تشریح احادیثِ صحیحہ کی روشنی میں

★ ہر واقعہ کی تائید علم و بصیرت اور دلیل و برہان کی رُو سے

★ غیر مسلموں کے اعتراضات کا مدلّل اور مسکت جواب

★ دنیا بھر کے اربابِ فکر و نظر کا خراجِ تحسین

بارگاہِ رسالتمآبؐ میں

• ایک انقلاب انگیز تصنیف • ایک عہد آفریں کوشش • عشق و خرد کا حسین امتزاج

• بڑا سائز • ضخامت قریب پانچسو صفحات • کاغذ نہایت اعلیٰ • جلد مضبوط • گردپوش جاذبِ نگاہ

قیمت ——— بیس روپے ۲۰/-

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور

مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور

تبویب القرآن

کے سلسلہ میں

احباب سے درخواست

جیسا کہ احباب کو معلوم ہے، میں کئی برسوں سے تبویب القرآن کی تدوین میں مصروف ہوں۔ تبویب القرآن سے مراد یہ ہے کہ آپ کے ذہن میں کوئی سوال ابھرے۔ کوئی موضوع سامنے آئے اسکے متعلق قرآن کریم میں جس قدر آیات مختلف مقامات پر آئی ہیں، وہ تمام کی تمام ایک ہی جگہ آپکے سامنے آجائیں تاکہ آپکو معلوم ہو جائے کہ اس باب میں قرآن مجید کی تعلیم کیا ہے۔ گویا یہ تالیف ایک لحاظ سے قرآنی تعلیمات و احکام کا انسائیکلوپیڈیا ہوگی۔ اس وقت تک میں اس کے سینکڑوں عنوانات مکمل کر چکا ہوں لیکن قرآن مجید تو ایک بحر ناپیدا کنار ہے اس لئے جوں جوں مزید غور کرتا ہوں نت نئے عنوانات سامنے آجاتے ہیں بنا بریں ظاہر ہے کہ اس قسم کی کتاب نہ تو کسی وقت بھی جامع ہو سکتی ہے نہ ہی مکمل کہلا سکتی ہے جوں جوں علم انسانی بڑھتا جائیگا اور زندگی کے تقاضے وسیع تر ہوتے جائینگے، اس کے مشمولات میں اضافہ ہوتا چلا جائیگا۔ اس لحاظ سے یہ کہنا مبالغہ نہیں ہوگا کہ اس کوشش میں حرفِ آخر دنیا کے آخری انسان کیلئے ہی چھوڑنا پڑیگا۔ بایں ہمہ میں چاہتا ہوں کہ یہ تالیف، ہمارے زمانے میں جس حد تک مکمل ہو سکتی ہے، اس کے لئے کوشش کر لی جائے۔

اس سلسلہ میں احباب سے میری درخواست ہے کہ آپکے ذہن میں جس قدر عنوانات آئیں ان سے آپ مجھے مطلع فرمائیں میں انہیں چیک کرونگا اور جو عنوانات میری فہرست میں شامل نہیں ہوتے ہونگے انہیں شامل کر لیا جائے گا آپ کے اس تعاون سے کتاب کی جامعیت میں اضافہ ہو جائیگا۔ آپکو اس سلسلہ میں وضاحت سے کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ ایک کاغذ پر صرف عنوانات لکھ دیجئے۔ اس کیلئے میں آپکا شکر گزار ہوں گا۔ والسلام!

پرویز

۲۵ بی۔ گلبرگ لاہور

إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ

ہندو کیا ہے

اور

کیا کرنا چاہتا ہے

تحریک پاکستان سے لیکر سازشِ مشرقی پاکستان تک کے

احوال و کوائف کا بصیرت افروز اور عبرت آموز

تجزیہ

ہندو کیا ہے

اور

کیا کرنا چاہتا ہے

> "ہماری اسکیم یہ ہے کہ ہم اس وقت جناح کو پاکستان بنا لینے دیں اور اس کے بعد معاشی طور پر یا دیگر انداز سے ایسے حالات پیدا کرتے جائیں جس سے مجبور ہو کر مسلمان گھٹنوں کے بل جھک کر ہم سے درخواست کریں کہ ہمیں پھر سے ہندوستان میں مدغم کر لیجئے۔"
>
> (پنڈت جواہر لعل نہرو - جون ۱۹۴۷ء تقسیم ہند کے وقت)

[طلوع اسلام کنونشن منعقدہ اکتوبر ۱۹۶۵ء میں پرویز صاحب کے ایک خطاب کا عنوان تھا — "ہندو کیا ہے؟"۔ یہ خطاب بڑا پُر از معلومات، حقائق پرور اور بصیرت افروز تھا۔ بہت اس قدر پسند کیا گیا کہ عام اشاعت کی غرض سے، اسے ایک پمفلٹ کی شکل میں بھی شائع کیا گیا۔ مشرقی پاکستان کے حالیہ واقعات کے سلسلہ میں ہندو کی جو سازش بے نقاب ہوئی ہے، اس کے پیش نظر قارئین کی طرف سے تقاضا موصول ہوا ہے کہ اس خطاب کو دوبارہ شائع کیا جائے۔ چنانچہ اسے ضروری حک و اضافہ کے ساتھ درج ذیل کیا جاتا ہے۔ اس قسم کے مقالات کی عام اشاعت کی ضرورت ہمیشہ رہے گی۔ کیونکہ نہ (بدقسمتی سے) پاکستان کے ساتھ ہندو کی ہمسائیگی ختم ہو سکتی ہے اور نہ ہی اس کی ذہنیت بدل سکتی۔ طلوع اسلام اس خطرہ کی مدافعت کے لئے شروع سے امکان بھر کوشش کرتا رہا ہے اور کرتا رہے گا۔ اس لئے کہ مملکت پاکستان کے استحکام کے لئے اشد ضروری ہے کہ ہماری ہر نئی نسل کے سامنے یہ حقیقت بے نقاب رہے کہ —

ہندو کیا ہے، اور کیا کرنا چاہتا ہے۔ (طلوعِ اسلام)

پرویز صاحب کا خطاب

ہماری نئی نسل جو یا تو تقسیمِ ہند کے وقت جھولوں میں تھی، اور یا اس کی پیدائش تشکیلِ پاکستان کے بعد ہوئی، اس اعتبار سے تو ایک گونہ خوش قسمت ہے کہ اسے ہندو کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں پڑا، لیکن یہی چیز قوم کے حق میں بڑی مضرت رساں ہے کہ اس نژادِ نو کو معلوم ہی نہیں کہ ہندو کیا ہے؟ اس باب میں خود ہماری حکومتوں نے بھی جو مجرمانہ تغافل برتا، فطرت اسے کبھی معاف نہیں کرے گی۔ انہوں نے نہ تو، ان نوجوانوں کی تعلیم کا کوئی ایسا انتظام کیا جس سے وہ اس حقیقت کو سمجھ لیتے کہ ایک الگ مملکت کا وجود کس طرح ہمارے دین کا بنیادی تقاضا تھا — یعنی اپنی آزاد مملکت کے بغیر ہم اس قابل ہی نہیں ہو سکتے تھے کہ اسلام کے مطابق زندگی بسر کر سکیں — اور نہ ہی کوئی ایسی تاریخ مرتب کی گئی جس سے ان نوجوانوں کو کم از کم اتنا ہی معلوم ہو جاتا کہ ہندو کیا ہے اور کوئی شریف انسان اس کے ساتھ نباہ نہیں کر سکتا۔ اس قسم کی تاریخ مرتب کرنے سے ہمارا مقصود یہ نہیں کہ ہم اپنے نوجوانوں کے دل میں ہندو کی طرف سے خواہ مخواہ جذبۂ نفرت ابھارنا چاہتے ہیں۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ ہندو، ان کے سامنے بے نقاب ہو کر آ جائے، تاکہ یہ اسے اپنے جیسا انسان سمجھ کر اس کے دامِ فریب میں گرفتار نہ ہو جائیں۔ غالب نے ایک جگہ کہا ہے کہ

فغانِ من دلِ خلق آب کرد، ورنہ ہنوز
نگفتہ ام کہ مرا کار با فلاں افتاد

یعنی ہماری حالت دیکھ کر ہی لوگوں کے دل سینوں میں پگھل گئے۔ جب انہیں معلوم ہوگا کہ ہمارا معاملہ کس شخص سے پڑا ہے تو نہ معلوم ان پر کیا گزرے گی؟

ہماری دشواری یہ ہے کہ ہماری نئی نسل کو ہندو کے ساتھ کبھی واسطہ نہیں پڑا — اور خدا کرے کہ ایسا کبھی نہ ہو — اور نہ ہی ہم نے، جنہیں ان کے ساتھ مدتوں واسطہ پڑتا رہا، انہیں یہ بتانے کی زحمت گوارا کی ہے کہ ہندو کیا ہے؟ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ ہمارے نوجوانوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ ہم ہندوستان میں اچھے بھلے بستے رہتے تھے، ان سے الگ ہو کر ہم نے خواہ مخواہ ایک مستقل خطرہ مول لے لیا؟ اس کی ضرورت کیا تھی؟ وہ ایسا سمجھنے اور کہنے میں کسی حد تک سچے ہیں۔ حیوانات کے لئے آسانی یہ ہے کہ وہاں ہر نوع کی شکل و صورت

انسان فریب میں آسکتا ہے

جداگانہ ہوتی ہے جس سے انہیں ایک دوسرے کی پہچان میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔ کسی بکری کو اس میں مغالطہ نہیں لگ سکتا کہ

جو جانور سامنے آ رہا ہے وہ درندہ شیر ہے یا بے ضرر ہرن۔ لیکن انسانوں کے معاملہ میں صورت یہ نہیں۔ یہاں انسانی پیکر سب ایک جیسے ہوتے ہیں' اس لئے اس باب میں تمیز کرنا بہت مشکل ہوتا ہے کہ ہمارے سامنے جو دوسرا انسان کھڑا ہے وہ رہزن ہے یا راہ نما۔ ہندوؤں کی شکل و صورت چونکہ انسانوں ہی جیسی ہے اس لئے ہمارے نوجوان انہیں انسان ہی سمجھتے ہیں۔ انہیں کیا معلوم کہ جنہیں وہ محض پیکروں کے دھوکے میں "انسان سمجھتے ہیں" وہ درحقیقت کیسے کیسے خونخوار درندے، مہیب نہنگ و اژدر یا مکار لومڑیاں ہیں۔ ان نوجوانوں کے سامنے ہندو کی ایک خفیف سی جھلک، ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران آئی تھی، لیکن ایک تو وہ حادثہ ہی برق کی چشمک یا شرار کی چمک سے زیادہ دیرپا نہیں تھا، دوسرے ہم نے ابھی تک اس کی بھی کوئی صحیح اور مکمل تصویر ان کے سامنے آویزاں نہیں کی، اس لئے وہ خفیف سی جھلک بھی ان کے آئینۂ ذہن سے محو ہوتی چلی جا رہی ہے۔ میں آج کی نشست میں' اس بھیروں ماتا' اس کالی دیوی کے چند ایک روپ آپ کے سامنے لانا چاہتا ہوں ۔۔۔ چند ایک اس لئے کہ اس کی مکمل تصویر کھینچنے کے لئے کئی ایک مجلدات کی ضرورت ہے ۔۔۔ سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کے لئے ۔۔۔ میرا خیال ہے کہ انہی چند ایک جھلکیوں سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ ہمارا معاملہ کس کے ساتھ پڑا ہے۔

ہندو اصولِ سیاست

ہندوؤں کی ساری "تاریخ میں" ۔۔۔ اگر اس بھان متی کے پٹارے کو تاریخ کہا جا سکے ۔۔۔ صرف ایک سیاسی فلاسفر پیدا ہوا ہے۔ نام تو اس کا چانکیہ تھا، لیکن وہ اپنے آپ کو نہایت فخر سے کوٹلیا کہتا تھا۔ اور ہندو بھی اسے اسی لقب سے پکارتے ہیں۔ کوٹلیا کے معنی ہیں مکار اور فریب کار۔ اس لقب سے ہی آپ اندازہ لگا لیجئے کہ یہ ذات شریف کیسے تھے؟ انہوں نے اصولِ سیاست پر ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے ارتھ ستنا شاستر۔ چونکہ یہ کتاب سنسکرت میں تھی اس لئے اب اس کا انگریزی ترجمہ شائع کر دیا گیا ہے۔ اس میں سیاست کے جو چند اصول بطور ضابطہ ہدایت دیئے گئے ہیں' وہ قابلِ غور ہیں۔ انہیں ذرا توجہ سے سنیئے گا۔

پہلا اصول ۔۔۔ حصولِ اقتدار اور ملک گیری کی ہوس کبھی ٹھنڈی نہ ہونے پائے۔

دوسرا اصول ۔۔۔ ہمسایہ سلطنتوں سے وہی سلوک روا رکھا جائے جو دشمنوں سے رکھا جاتا ہے۔ تمام ہمسایوں پر ہمیشہ کڑی نگرانی رکھی جائے۔

تیسرا اصول ۔۔۔ غیر ہمسایہ سلطنتوں سے دوستانہ تعلقات قائم کئے جائیں۔

چوتھا اصول ۔۔۔ جن سے دوستی رکھی جائے' ان سے دوستی میں ہمیشہ اپنی غرض پیشِ نظر رہے اور مکارانہ

سیاست کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے۔

پانچواں اصول — دل میں ہمیشہ رقابت کی آگ مشتعل رکھی جائے۔ ہر بہانہ سے جنگ کی چنگاریاں سلگائی جاتی رہیں۔ جنگ میں انتہائی تشدد سے کام لیا جائے حتیٰ کہ خود اپنے شہریوں کے مصائب و آلام کی بھی پرواہ نہ کی جائے۔

چھٹا اصول — دوسرے ملکوں میں مخالفانہ پراپیگنڈہ، تخریبی کارروائیاں، ذہنی انتشار پیدا کرنے کی مہم جاری رکھی جائے۔ وہاں اپنے آدمی ناجائز طریقے سے داخل کر کے، ففتھ کالم بنایا جائے۔ اور یہ سب کچھ مسلسل انداز سے کیا جائے۔

ساتواں اصول — رشوت اور دیگر اسی قسم کے ذرائع سے اقتصادی جنگ جاری رکھی جائے۔ اور دوسرے ملکوں کے غداروں کو خریدنے کی کوشش کی جائے۔

آٹھواں اصول — امن کے قیام کا خیال تک بھی دل میں نہ لایا جائے خواہ ساری دنیا تمہیں اس پر مجبور کیوں نہ کرے۔

یہ ہیں مختصر الفاظ میں، سیاست کے وہ اصول جو ان کے ایک مہاتما نے انہیں دیئے۔ یہ مہاتما، ان کے ست جگ کے زمانے کی پیداوار ہے — یعنی وہ زمانہ جس میں (ان کے عقیدہ کے مطابق) بھارت میں سچائی کا دور دورہ تھا۔ اس کے بعد کل جگ میں ایک اور مہاتما پیدا ہوئے جنہیں گاندھی جی کہا جاتا ہے۔ انہیں سچائی کا مجسمہ اور اہنسا (عدم تشدد) کا اوتار کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ ان مہاتما جی کی کیفیت کیا تھی، اس کے متعلق قائداعظمؒ کی زبان سے سنیئے جنہیں ان کے ساتھ رات دن واسطہ پڑتا تھا۔ قائداعظمؒ نے مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن (جالندھر) کے اجلاس (منعقدہ ۱۹۴۳ء) میں پبلک پلیٹ فارم پر سے کہا تھا کہ

گاندھی جی

> مشکل یہ ہے کہ گاندھی جی کا مقصد وہ نہیں ہوتا جو وہ زبان سے کہتے ہیں اور جو ان کا درحقیقت مقصد ہوتا ہے اسے کبھی زبان پر نہیں لاتے۔

اسی طرح انہوں نے اگست ۱۹۴۲ء میں ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ

> ہمیں جس حریف سے پالا پڑا ہے وہ گرگٹ کی طرح اپنا رنگ بدلتا رہتا ہے۔ جب ان کے (یعنی مہاتما گاندھی کے) مفید مطلب ہوتا ہے وہ کہہ دیتے ہیں کہ وہ کسی کے نمائندہ نہیں۔ وہ محض انفرادی حیثیت سے گفتگو کر رہے ہیں۔ وہ کانگریس کے چار آنہ کے ممبر بھی نہیں۔ اور جب ضرورت ہوتی ہے تو سارے ہندوستان کے واحد نمائندہ بن جاتے ہیں۔ جب اور حربوں سے کام نہیں چلتا تو مرن برت

> رکھ دیتے ہیں جب کوئی دلیل بن نہیں پڑتی تو "اندرونی آواز" کو بدل لیتے ہیں۔ کہتے کہ ایسے شخص سے ہم کس طرح بات کر سکتے ہیں۔ وہ تو ایک چیستان ہیں، معمہ ہیں۔

ان کی "مہاآتمیت" کا یہ عالم تھا کہ دوسری جنگِ عظیم کے دوران جب انگلستان پر دن رات بمباری ہو رہی تھی اور جاپانی کلکتہ تک بڑھ آئے تھے، وہ وائسرائے کے ہاں گئے اور کہا کہ جب میں لندن پر بمباری کی خبریں پڑھتا ہوں، اور وہاں کے جوانوں، بوڑھوں، بچوں، عورتوں پر جو کچھ گزر رہی ہے، اسے سنتا ہوں تو میری روح کانپ اٹھتی ہے مجھے راتوں کو نیند نہیں آتی۔ ایسے نازک حالات میں میں انگریزوں کے لئے ہندوستان میں کسی پریشانی کا موجب نہیں بننا چاہتا۔ میں تمام اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر جنگ کے سلسلہ میں بلاشروط تعاون کا یقین دلاتا ہوں۔ یہ کہتے کہتے ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ وائسرائے بہت متاثر ہوئے اور ان کی ہمدردی اور تعاون کا شکریہ ادا کیا۔

مہاتما جی نے اُدھر یہ کیا اور اِدھر کانگریس کی مجلسِ عاملہ سے ریزولیوشن پاس کرا دیا کہ اگر حکومت، ملک کے اختیارات، کانگریس کی طرف منتقل کرنے کا وعدہ نہیں کرتی تو ہم ملک کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے، یہاں کے نظم و نسق کو تہ و بالا کر کے رکھ دیں گے۔ انگریزوں کو یہاں سے نکال باہر کریں گے — اور جب وائسرائے نے گاندھی جی سے پوچھا کہ یہ کیا؟ تو انہوں نے نہایت معصومیت سے فرمایا کہ میرا کانگریس پر کیا اختیار ہے۔ میں تو اس کا چار آنے کا ممبر بھی نہیں۔

اہمسا کا اوتار

مہاتما گاندھی اپنے آپ کو اہمسا کا اوتار کہا کرتے تھے۔ اہمسا کے معنی یہ ہیں کہ خواہ کچھ بھی ہو کسی کے خلاف تشدد کا استعمال نہ کیا جائے۔ انجیل کی — ایک گال پر طمانچہ کھا کر، دوسرا گال سامنے کر دینے کی — تعلیم پر عمل کیا جائے۔ لیکن انہی مہاتما جی کا یہ عالم تھا کہ ۱۹۳۹ء کے اواخر کی بات ہے، سندھ میں مسجد منزل گاہ کے سلسلہ میں ہندوؤں کی طرف سے مسلمانوں پر بے حد مظالم ہوئے۔ ہندوؤں نے یہ سب کچھ بھی کیا اور گویا کہ اصولِ سیاست کے مطابق، مہاتما جی کو تار دے دیا کہ مسلمانوں کے ہاتھوں ہمارا کچھ بھی محفوظ نہیں۔ مہاتما جی نے نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ نہ کسی تحقیق کی ضرورت سمجھی نہ تفتیش کی اور اپنے اخبار میں لکھ مارا کہ:

> اہمسا ایک دن میں نہیں سیکھا جاتا۔ دوسرا طریق یہ ہے جسے دنیا برتتی چلی آ رہی ہے یعنی جان و مال کی حفاظت ہتھیاروں کے ذریعے کی جائے۔ سندھیوں کو چاہیئے کہ لٹیروں اور حملہ آوروں سے اپنی حفاظت کا ڈھنگ سیکھیں۔

(ہریجن ۔ بابت ۱۲ ۱۲/۳۹)

بھی مہاتما جی ہی تھے جنہوں نے جنگ کے دوران انگریزوں سے کہا تھا کہ ہٹلر کا مقابلہ ہتھیاروں سے نہ کرو۔ اہنسا کے ذریعے کرو۔ اور سرحدی گاندھی عبدالغفار خاں کو ایڈیشن دیا تھا کہ پٹھانوں سے جا کہہ دو کہ اہنسا میں ذرا سی بھی ہنسا کی لاگ نہ رہے۔ اور دوسری طرف کلکتہ کی ہندو عورتوں سے تاکید کہا جاتا تھا کہ اپنے پاس پستول اور بندوق رکھو اور فائر کرنا سیکھو۔ گاندھی جی بڑے فخر سے کہا کرتے تھے کہ

> میں اپنے آپ کو سناتنی ہندو کہتا ہوں کیونکہ میں ویدوں، اُپ نشدوں، پرانوں اور ہندوؤں کی تمام مذہبی کتابوں کو مانتا ہوں۔ اوتاروں کا قائل ہوں اور تناسخ کے عقیدہ پر یقین رکھتا ہوں۔ میں گاؤ رکھشا کو اپنے دھرم کا جزو سمجھتا ہوں اور بت پرستی سے انکار نہیں کرتا۔ میرے جسم کا رواں رواں ہندو ہے۔
>
> (ینگ انڈیا۔ ۱۲ ۱/۱۰)

جو گاؤ رکھشا ان کے دھرم کا جزو تھی اس کے متعلق انہوں نے ۱۹۱۸ء میں کہا تھا کہ

> یہ خیال نہیں کرنا چاہیئے کہ یورپین کے لئے گاؤ کشی جاری رکھنے کی بابت ہندو کچھ بھی محسوس نہیں کرتے۔ میں جانتا ہوں کہ ان کا غصہ اس خوف کے نیچے دب رہا ہے جو انگریزی عملداری سے پیدا کر دیا ہے۔ مگر ایک ہندو بھی، ہندوستان کے طول و عرض میں ایسا نہیں جو ایک دن اپنی سرزمین کو گاؤ کشی سے آزاد کر لینے کی امید نہ رکھتا ہو۔ ہندو مت، عیسائی یا مسلمان کو تلوار کے زور سے بھی مجبور کرنے سے تامل نہیں کریگا کہ وہ گاؤ کشی کو بند کر دیں۔
>
> (الفضل - ۳/۱۸ - ۹ - بحوالہ اسٹیٹسمین)

یہ تھی سچائی کے اوتار اور اہنسا کے دیوتا گاندھی جی کی کیفیت۔ گاندھی جی کیا تھے اس کے متعلق قائداعظمؒ نے ایک فقرہ میں وہ سب کچھ کہہ دیا تھا جس کے لئے کتابوں کی کتابیں بھی کافی نہیں ہو سکتیں۔ بات یوں ہوئی کہ ایک دن گاندھی جی سیوگرام آشرم میں، اپنی کٹیا میں بیٹھے پرارتھنا میں محو تھے کہ ایک کونے سے ایک سانپ اندر گھس آیا۔ مہاتما جی خاموشی سے پرارتھنا میں مصروف رہے۔ اس نے کٹیا کا چکر کاٹا اور آہستہ سے باہر چلا گیا۔ ہندو اخبارات نے اسے مہاتما جی کی کرامت قرار دے کر بہت اچھالا۔ صبح کو یہ خبریں اخبارات میں شائع ہوئیں تو ایک اخبار کا رپورٹر قائداعظم کے پاس گیا اور اس واقعہ کا ذکر کرنے کے بعد ان سے پوچھا کہ آپ کا اس کے متعلق کیا خیال ہے قائداعظمؒ نے سر ہلایا اور نہایت سنجیدگی سے کہا کہ

YES; PROFESSIONAL ETIQUETTE

یہ وہ ریمارکس ہیں جن کا بس لطف لیا جا سکتا ہے۔ سمجھایا نہیں جا سکتا۔

(۰)

جس قوم کے "مہاتما" ایسے ہوں، اس کے عام افراد جس سیرت و کردار کے مالک ہو سکتے ہیں' اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مسٹر سری پرکاش پاکستان میں، بھارت کے پہلے ہائی کمشنر تھے۔ انہوں نے ۱۳ نومبر ۱۹۴۹ء کی شام'

ہندومت کا ضابطہ اخلاق

تھیاسوفیکل ہال کراچی میں ایک تقریر کی تھی جس کا عنوان تھا "ہندومت ایک ضابطہ اخلاق کی حیثیت سے ہے"۔ اس تقریر میں انہوں نے واضح الفاظ میں کہا کہ جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ ہندومت کوئی مستقل اخلاقی ضابطہ متعین کرتا ہے جس پر سوسائٹی کی بنیاد رکھی جا سکے، وہ ایک بہت بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ ہندومت' انسانی زندگی کے لئے کوئی غیر متبدل اصول و اقدار پیش نہیں کرتا بلکہ وہ ہر موقعہ اور ہر مقام کے لحاظ سے، مختلف اصول وضع کرتا ہے جو ایک دوسرے سے یکسر متضاد ہو سکتے ہیں۔ مثلاً وہ سوسائٹی کے ایک طبقہ (براہمنوں) کو اہنسا (عدم تشدد) کی تعلیم دیتا ہے تو دوسرے طبقہ (کھشتریوں) کو قتل و خوں ریزی سکھاتا ہے۔ وہ پنڈتوں سے کہتا ہے کہ سچ بولو۔ لیکن ویشوں (تجارت پیشہ لوگوں) کو کبھی اس کا پابند نہیں ٹھہراتا کیونکہ وہ کہتا ہے کہ سچ بولنے سے تجارت میں نقصان ہوتا ہے۔ اس لئے وہ انہیں جھوٹ بولنے کی اجازت دیتا ہے۔ مختصراً یہ کہ وہ ایک قسم کے حالات میں سچ اور دیانت کی تاکید کرتا ہے تو دوسری قسم کے حالات میں جھوٹ اور فریب کو جائز قرار دیتا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے کہا کہ

> کسی کو یہ بات اچھی لگے یا نہ لگے، لیکن یہ حقیقت ہے جس کا کھلے بندوں اعتراف کرنا چاہیئے کہ ہندو مت میں کوئی اصولِ زندگی قطعی (ABSOLUTE) نہیں۔ ہر مصلحت کے لئے اس کا الگ اصول ہے[1]۔ ہندومت ایک عملی مذہب ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ہر موقع پر دیانت اور سچائی سے کام نہیں چل سکتا، اس لئے وہ کبھی ایسی تعلیم نہیں دیتا جو ناممکن العمل ہو۔ یہی وہ راز ہے جس کی بنا پر ہندومت ہزار ہا سال سے مختلف حالات اور متباین ماحول میں زندہ رہا ہے اور زندہ رہے گا۔
>
> (طلوعِ اسلام۔ بابت دسمبر ۱۹۴۹ء)

لال بہادر شاستری

یہی ہے وہ ہندو دھرم جس کے سب سے بڑے عالم[2] اور ہندوستان کے (اس زمانے کے) وزیر اعظم، مسٹر لال بہادر شاستری نے، جنوری ۱۹۶۵ء میں بنارس میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ

> ملک میں لوگ یہ چاہتے ہیں کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جائے۔ لیکن غور کرنے کی ضرورت ہے کہ کیا

---

[1] یہی تعلیم پاکستان میں مودودی صاحب دیتے ہیں۔

[2] شاستری بہت بڑے عالم کو کہتے ہیں، یعنی جو شاستروں کا علم رکھتا ہو۔

یہ رویہ ہماری روایات کے مطابق ہوگا؟ ہمارے سامنے دو راستے ہیں۔ ایک تو یہی راستہ ہے کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جائے اور دوسرا راستہ امن وخوشحالی کا ہے جو قوم کے باپو، مہاتما گاندھی نے ہمیں سکھایا ہے۔ امن اور عدم تشدد کا جو راستہ ہمیں گاندھی جی نے سکھایا ہے وہ نہ صرف فطری طور پر مناسب ہے بلکہ عملی نقطۂ نگاہ سے بھی مفید ہے۔ جب ہم پوری دنیا میں امن وصلح کی تبلیغ کرتے ہیں تو ہم کس طرح دوسرا راستہ اختیار کر سکتے ہیں؟

(اخبار مدینہ، بجنور، یکم جنوری ۱۹۶۵ء بحوالہ طلوع اسلام۔ فروری ۱۹۶۵ء)

یہ کچھ انہوں نے پبلک پلیٹ فارم سے جنوری میں کہا اور اسی سال ستمبر میں چوروں کی طرح، اکیس ڈویژن فوج، پاکستان کے سر پر لاکھڑی کر دی۔ صحیح ہے۔ اس قسم کے "باپو" کے اسی قسم کے سپوت ہونے چاہئیں!! یہی تھے وہ شاستری جی جن کی حکومت سے خود ہندوستان کے صحافی، تنگ آکر چیخ اٹھے تھے کہ

شاستری حکومت ایک سانپ ہے جس کے سینکڑوں منہ ہیں اور ہر منہ میں زبان الگ الگ بولی جاتی ہے اور ہم فانی انسان اس کا فیصلہ ہی نہیں کر سکتے کہ ان میں سے کس کی بات سرکاری اعلان ہے اور کس کی نہیں۔ حساس طبائع نے اندازہ لگایا ہوگا کہ حکومت کا سربراہ ــــ مسٹر شاستری ــــ خود اس کابینہ کا منجھا ہوا فنکار ہے۔

(شیو ایچ۔ بحوالہ ہندوستان ٹائمز ۲/۵/۔ طلوع اسلام ستمبر ۱۹۶۶ء)

یہ ہے ہندو دھرم۔ اور یہ ہیں اس دھرم کے پجاری ــــ کوٹلیا سیاست کا امام۔ مہاتما گاندھی ستیا کے اوتار اور شاستری آنجہانی، اس باپو کے نامور سپوت!

یہ ہے ہندو دیوتا کے مجسمہ کا ایک روپ۔ اب آگے بڑھیے!

(۰)

مذہب کے متعلق

مطالبۂ پاکستان کی بنیاد اس دعویٰ پر تھی کہ اسلام کی رُو سے ہندوستان میں بسنے والے مسلمان، اپنے دین کی بنا پر ایک الگ قوم ہیں اور وہ اپنے دین کے مطابق اسی صورت میں زندگی بسر کر سکتے ہیں جب ان کی اپنی آزاد مملکت ہو جس میں وہ قوانین خداوندی نافذ کر سکیں۔ یہ دعویٰ مسلمانوں کا تھا جس کا تعلق مسلمانوں کے "مذہب" سے تھا۔ ظاہر ہے کہ اس میں کسی غیر مسلم کو دخل دینے کا حق ہی نہیں پہنچتا تھا۔ لیکن دیکھئے کہ ہندوؤں کا اس باب میں رویہ کیا تھا۔ پنڈت جواہر لال نہرو، نے آل انڈیا نیشنل کانگریس منعقدہ مارچ ۱۹۳۷ء کے خطبۂ صدارت میں کہا تھا۔

ایسے لوگ ابھی تک زندہ ہیں جو ہندوؤں اور مسلمانوں کا ذکر اس طور پر کرتے ہیں گویا دو ملتوں

اور قوموں کے بارے میں گفتگو ہے۔ جدید دنیا میں اس دقیانوسی خیال کی گنجائش نہیں۔

(طلوع اسلام۔ بابت جون۔ ۱۹۳۸ء)

یہ تو رہا، دو قومی نظریہ کے متعلق خود مذہب کے سلسلہ میں انہوں نے اپنی کتاب "میری کہانی" میں لکھا۔

جس چیز کو مذہب یا منظم مذہب کہتے ہیں، اسے ہندوستان میں اور دوسری جگہ دیکھ کر میرا دل بیٹھ سا گیا ہے۔ میں نے اکثر مذہب کی مذمت کی ہے اور اسے یکسر مٹا دینے تک کی آرزو کی ہے۔ قریب قریب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اچھے یقین اور ترقی دشمنی کا بے دلیل عقیدت اور تعصب کا۔ توہم پرستی اور لوگوں سے بے جا فائدہ اٹھانے کا۔ قائم شدہ حقوق اور مستقل حقوق کی بقا کا حامی ہے۔

(بحوالہ طلوع اسلام۔ جون ۱۹۳۸ء)

آپ کہیں گے کہ پنڈت جواہر لال نہرو دہریہ تھے۔ اس لئے مذہب کے متعلق ان کا یہ طرز عمل حق بجانب تھا — وہ سیکولر نظام کے حامی تھے، اس لئے ان کی اس مخالفت میں اسلام کی خصوصیت نہیں۔ وہ تمام مذاہب کے مخالف تھے۔ لیکن اول تو آپ نے اس اقتباس میں "منظم مذہب" کی تخصیص پر غور نہیں فرمایا۔ منظم مذہب — یعنی وہ مذہب جو مذہب کی بنیاد پر ایک جداگانہ تنظیم کا حامی ہے (جسے قوم کہا جاتا ہے) ہندومت نہیں، اسلام ہے۔ دوسرے یہ کہ پنڈت جواہر لال ہندومت کو سرے سے مذہب ہی قرار نہیں دیتے تھے۔ وہ اپنی کتاب "میری کہانی" میں دوسری جگہ لکھتے ہیں۔

ہندومت کے دائرے میں بے حد مختلف اور متضاد خیالات و رسوم داخل ہیں۔ اکثر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہندومت پر صحیح معنوں میں مذہب کا اطلاق ہی نہیں ہوتا۔ ممکن ہے ایک شخص کھلم کھلا خدا کا منکر ہو (جیسے قدیم فلسفی چاروک) لیکن کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ شخص ہندو نہیں رہا۔ جو لوگ ہندو گھرانوں میں پیدا ہوتے ہیں وہ چاہے کتنی ہی کوشش کریں ہندومت ان کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ میں برہمن پیدا ہوا تھا اور برہمن ہی سمجھا جاتا ہوں۔ چاہے مذہبی اور سماجی رسموں کے متعلق میرے خیالات اور اعمال کچھ ہی ہوں۔

اب ظاہر ہے کہ جب پنڈت نہرو کے نزدیک ہندومت کوئی مذہب نہیں تھا، تو اسے مٹانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ تو اسلام تھا جو ان کی نگاہوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا اور جسے وہ مٹانا چاہتے تھے۔ چنانچہ اس کی تصریح، نہرو کے ہم مرتبہ ایک کانگریسی لیڈر مسٹر ولبھائی ڈیسائی نے ان الفاظ میں کر دی کہ

اب یہ ناممکن ہوگا کہ کوئی ایسا نظام قائم کیا جائے جس کی بنیاد مذہب پر ہو۔ اب وقت آچکا ہے کہ ہم اس امر کا اعتراف کر لیں اور اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیں کہ ضمیر، مذہب اور خدا کو ان کے

مناسب مقام یعنی آسمان کی بلندیوں پر رہنے دیا جائے۔

(ہندوستان ٹائمز ۲۶ ھ - بحوالہ طلوع اسلام اگست ۱۹۳۸ء)

قرآنی حکومت کیخلاف

اور اگر آپ اس سے بھی واضح تر الفاظ میں سننا چاہتے ہیں تو وہ بھی سن لیجئے۔ ۱۹۴۱ء میں "اکھنڈ بھارت کانفرنس" کا اجلاس لدھیانہ میں منعقد ہوا جس کی صدارت مسٹر منشی نے کی۔ انہوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں کہا کہ تمہیں اس کا علم ہے کہ نظریۂ پاکستان کا مفہوم کیا ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ

> مسلمان اپنے لئے ایسے مساکن بنائیں جہاں زندگی اور طرزِ حکومت قرآنی اصولوں کے سانچے میں ڈھل سکے اور جہاں اردو ان کی قومی زبان بن سکے۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ پاکستان مسلمانوں کا ایسا خطۂ ارض ہوگا جس میں اسلامی حکومت قائم ہوگی۔

اس کے بعد انہوں نے کہا کہ

> ہندو قوم خواہ کتنی ہی بزدل اور غیر منظم کیوں نہ ہو وہ کبھی اسے برداشت نہیں کرسکتی کہ مسلمان اس قسم کی حکومت قائم کرلیں۔ اس حکومت میں ہندو قوم کے افراد شمشیرِ دستاں کا نشانہ بنائے جائیں گے ان کی عورتوں کی عصمت دری اور ان کے مقدس مقامات کی بےحرمتی ہوگی۔

(بحوالہ طلوع اسلام۔ دسمبر ۱۹۴۱ء)

واضح رہے کہ یہ خیالات، ہندو قوم کے بازاری افراد کے نہیں تھے۔ یہ ان کے چوٹی کے لیڈروں کے خیالات اور عزائم تھے۔ اور ان کے بلند ترین اخبارات دن رات یہ کہتے رہتے تھے کہ

> حکومتِ الٰہی کا تصور ایک داستانِ پارینہ ہے اور مسلمانوں کا یہ فعل عبث ہوگا اگر وہ ہندوستان جیسے ملک میں اس کے احیاء کی کوشش کریں۔

(ہندوستان ٹائمز۔ ۳ جون ۱۳ - بحوالہ طلوع اسلام۔ دسمبر ۱۹۳۹ء)

لیکن تماشہ یہ ہے کہ ایک طرف مسلمانوں کے متعلق تو یہ کچھ کہا جارہا تھا اور دوسری طرف ہندوؤں سے یہ کہا جاتا تھا کہ

> ہندوستان کو نظریہ اور عمل دونوں لحاظ سے ایک ہندو اسٹیٹ ہونا چاہیئے جس کا کلچر ہندو، جس کا مذہب ہندو ہو اور جس کی حکومت ہندوؤں کے ہاتھ میں ہو۔

(طلوع اسلام ——— دسمبر ۱۹۳۸ء)

یہ الفاظ ڈاکٹر رادھا مکرجی کے تھے جو ہندو مہاسبھا کے نائب صدر اور بنگال میں کانگریس پارٹی کے لیڈر تھے۔

یہ الفاظ انہوں نے آل انڈیا ہندو ویدک یوتھ کانفرنس (لاہور) کے خطبۂ صدارت میں ارشاد فرمائے تھے۔

اور مسٹر ساورکر نے یہ کہہ کر سارا ٹنٹا ہی ختم کر دیا تھا کہ

لفظ ہندو سے عبارت ہے ہر وہ شے جو ہندوستان کی ہو۔ مثلاً کلچر، نسل اور روایات وغیرہ اور ہندو کے معنی ہیں ہر وہ شخص جو ہندوستان کا رہنے والا ہو۔

(اسٹیٹسمین - ۲۰/۳۹ - بحوالہ طلوع اسلام - اپریل ۱۹۳۹ء)

آپ غالباً متعجب ہونگے کہ اس باب میں گاندھی جی کا "ذکر خیر" آیا ہی نہیں۔ کیا وہ خاموش بیٹھے تھے! جی نہیں۔ گاندھی جی ایسے اہم معاملہ میں خاموش کیسے رہ سکتے تھے۔ لیکن ان کا بات کرنے کا انداز اپنا تھا۔ سنیئے کہ اس باب میں وہ کیا کرتے اور کیا کہتے تھے۔

گاندھی جی کا ایڈیشن

مہاتما گاندھی نے، ۱۵ ستمبر ۱۹۴۴ء کو قائداعظم کے نام ایک خط میں لکھا تھا۔

میں تاریخ میں اس کی مثال نہیں پاتا کہ کچھ لوگ جنہوں نے اپنے آباء و اجداد کا مذہب چھوڑ کر، ایک نیا مذہب قبول کر لیا ہو، وہ اور ان کی اولاد یہ دعویٰ کرے کہ وہ اپنے آباء و اجداد سے الگ قوم بن گئے ہیں۔ اگر ہندوستان اسلام کی آمد سے پہلے ایک قوم تھا تو اسلام کے بعد بھی اسے ایک قوم ہی رہنا چاہیئے۔ خواہ اس کے سپوتوں میں سے ایک کثیر تعداد نے اسلام قبول کر لیا ہو۔

پھر انہوں نے اپنے اخبار "ہریجن" کی ۹ فروری ۱۹۴۶ء کی اشاعت میں لکھا۔

اگر میں ڈکٹیٹر ہوتا تو مذہب اور حکومت کو بالکل الگ الگ کر دیتا۔ مجھے میرے مذہب کی قسم، میں اس کے لئے اپنی جان تک دے دیتا۔ مذہب میرا ذاتی معاملہ ہے۔ حکومت کو اس سے کیا واسطہ، مذہب ہر شخص کا ذاتی معاملہ ہے۔

آپ کہیں گے کہ گاندھی جی سیکولر نظامِ حکومت کے قائل تھے اور سیکولر نظام حکومت کے قائل کو مذہب کے متعلق یہی عقیدہ رکھنا چاہیئے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا گاندھی جی واقعی سیکولر نظامِ حکومت کے قائل تھے؟ اسکا جواب ہم سے نہیں اس خط کے الفاظ سے لیجیے جو قائداعظم نے مسٹر گاندھی کو یکم جنوری ۱۹۴۸ء کو لکھا تھا۔ اس میں انہوں نے (گاندھی جی سے) کہا تھا۔

آج آپ اس سے انکار کرتے ہیں کہ قومیت کے تعین میں مذہب کو کوئی دخل ہونا چاہیئے۔ لیکن جب خود آپ سے یہ سوال کیا گیا تھا کہ آپ کا زندگی میں مقصد کیا ہے۔ آپ کے نزدیک وہ جذبۂ محرکہ کیا ہے جو ہمیں کسی کام کے کرنے پر آمادہ کرتا ہے — کیا وہ جذبہ، وہ مقصد مذہبی ہے یا معاشرتی،

یا سیاسی — تو آپ نے کہا تھا کہ "خالص مذہبی"۔

یعنی اپنی سیاسی جدوجہد کا جذبۂ محرکہ خالص مذہبی، اور دوسروں کو تلقین کہ وہ مذہب کو سیاست میں دخیل کار نہ ہونے دیں۔ یہی تھی گاندھی جی کی وہ دورُخی پالیسی جس کے پیشِ نظر علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ ؎

نگہ دارد برہمن کارِ خود را — نمی گوید بکس اسرارِ خود را
بمن گوید کہ از تسبیح بگذر — بدوشِ خود برد زنّارِ خود را

ہندوستان کی حکومت

اور مسلمانوں کا یہ طعن کسی مفروضہ پر مبنی نہیں تھا، ایک حقیقت تھا۔ گاندھی جی اِدھر ان سے یہ کہہ رہے تھے کہ مذہب کو سیاست سے الگ رکھو۔ اور اُدھر ہندوستان میں جس قسم کی سیاست کو رائج کرنا چاہتے تھے، اس کے متعلق، کانگریس کے جنرل سیکرٹری، آچاریہ کرپلانی نے، اگست ۱۹۳۹ء میں اپنے ایک طویل بیان میں کہا تھا کہ

> گاندھی جی نے کانگریس کو بتایا کہ ہمارا کام صرف یہ نہیں کہ ملک کی سیاسی باگ ڈور انگریز کے ہاتھ سے چھین کر اہلِ ملک کے ہاتھ میں دے دیں۔ بلکہ سب سے ضروری چیز یہ ہے کہ ہم اپنی تمام جدوجہد کی بنیاد کسی ایسے فلسفۂ حیات پر رکھیں جس کے دائرہ میں ہماری معاشرت، اخلاق اور روحانیت سب کچھ داخل ہو۔ بالفاظِ دیگر، ہماری تحریک کو صرف سیاسی نہیں ہونا چاہیئے بلکہ اسے روحانی اور اعلیٰ فلسفۂ زندگی کے ماتحت ہونا چاہیئے تاکہ اس جدوجہد سے نہ صرف ہماری سیاسی زندگی متاثر ہو بلکہ ہماری زندگی کا ہر شعبہ اس سے اثر پذیر ہو اور ہماری زندگی کا ایک نیا باب شروع ہو جسے ہم تاریخ کا نیا دَور کہہ سکیں۔ زندگی کا یہی نیا باب اور نیا دور ہے جسے گاندھی جی کانگریس کے ذریعے ہندوستان میں لانا چاہتے ہیں۔

واردھا اسکیم

گاندھی جی کو سب سے بڑا ڈر یہ کھائے جا رہا تھا کہ مسلمان بچوں کے دل میں یہ عقیدہ راسخ ہوتا ہے کہ اسلام باقی مذاہب کے مقابلہ میں افضل ہے۔ ان کی اسکیم یہ تھی کہ مسلمان بچوں کے دل سے اس خیال کو نکال دیا جائے تاکہ ان کے ذہن سے اپنے مذہب کی عظمت و اہمیت کا احساس مٹ جائے۔ اس کے لئے انہوں نے، ڈاکٹر ذاکر حسین خان (مرحوم) کے مشورہ اور تعاون سے 'ہندوستانی بچوں کے لئے ایک مشترکہ تعلیم کی اسکیم مرتب کی (جو واردھا کی تعلیمی اسکیم کے نام سے مشہور ہوئی)۔ اس اسکیم کا مقصد کیا تھا، اس کا اندازہ گاندھی جی کے اس وضاحتی بیان سے لگایا جا سکتا ہے جو انہوں نے اس سلسلہ میں اخبارات کو دیا تھا۔ اس میں انہوں نے کہا تھا۔

> مختلف طبقات و مذاہب کے بچوں میں، رواداری اور دوستی کی جو روح پیدا ہو رہی ہے، اسکے

پیشِ نظر میں اس بات کو سخت مہلک اور خطرناک سمجھتا ہوں کہ ان کو یہ سکھایا جائے کہ ان کا مذہب دیگر تمام مذاہب پر برتری رکھتا ہے یا جس مذہب کے وہ قائل ہیں بس وہی مذہب سچا ہے۔

(ہندوستان ٹائمز ۳۰ ستمبر ۱۷۔ بحوالہ طلوعِ اسلام ماہ اگست ۱۹۳۸ء)

[طلوعِ اسلام نے اس زمانے اس ملعون تعلیمی اسکیم کے خلاف کس قدر ملک گیر مہم چلائی، اور کس طرح اسے اور اس کے تحت مرتب کردہ نصاب کی کتابوں کو غرق سمندر کرایا گیا، یہ ایک الگ داستان ہے جس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں]

لیکن جب گاندھی جی اور ان کے چیلوں چانٹوں کی ان تمام سازشوں اور روباہ بازیوں کے باوجود، تحریکِ

مطالبۂ پاکستان کی مخالفت

پاکستان آگے بڑھتی گئی حتیٰ کہ مارچ ۱۹۴۰ء میں حصولِ پاکستان کا مشہور ریزولیوشن پاس ہو گیا تو گاندھی جی کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور وہ کھل کر سامنے آ گئے۔ انہوں نے ۷ اپریل ۱۹۴۰ء کو اپنے ایک بیان میں کہا۔

میں پوری جرأت و جسارت کے ساتھ اس امر کا اعلان کرتا ہوں کہ مسٹر جناح اور ان کے ہم خیال حضرات اپنی اس روش سے اسلام کی کوئی خدمت سرانجام نہیں دے رہے بلکہ وہ اس پیغام کی غلط ترجمانی کر رہے ہیں جو لفظ "اسلام" کے اندر پوشیدہ ہے مجھے یہ کچھ کہنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ آجکل مسلم لیگ کی طرف سے جو کچھ ہو رہا ہے اس سے میرے دل پر سخت ٹھیس لگ رہی ہے۔ میں اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کروں گا اگر میں ہندوستان کے مسلمانوں کو اس دروغ بافی سے متنبہ نہ کر دوں جس کا اس نازک وقت میں ان میں پروپیگنڈہ کیا جا رہا ہے۔

(بحوالہ طلوعِ اسلام۔ جون ۱۹۴۰ء)

پھر انہوں نے، اسی سلسلۂ مضامین کی دوسری قسط میں (۴ اپریل ۱۹۴۰ء کو) لکھا۔

میری رُوح اس امر کے تصور سے بغاوت کرتی ہے کہ اسلام اور ہندومت دو مختلف اور متضاد کلچر اور نظریۂ حیات ہیں۔ کسی ایسے نظریہ کا تسلیم کر لینا میرے نزدیک خدا کے انکار کے مرادف ہے۔ میں اس نظریہ کے خلاف یقیناً بغاوت کروں گا کہ وہ لاکھوں مسلمان جو ابھی کل تک ہندو تھے، اسلام قبول کر کے اپنی قومیت بھی بدل بیٹھے ہیں۔ (ایضاً)

پھر انہوں نے ۵ مئی ۱۹۴۰ء کو لکھا کہ

میں ایک تنگ نظر ہندومت یا تنگ نظر اسلام کا تصور نہیں کر سکتا۔ ہندوستان ایک بہت بڑا ملک ہے اور ایک بہت بڑی قوم جو مختلف تہذیبوں پر مشتمل ہے اور یہ تہذیبیں اب ایکدوسرے

میں مدغم ہونا شروع ہو گئی ہیں۔ لیکن مسلم لیگ نے مسلمانوں کو یہ سبق پڑھانا شروع کر دیا ہے کہ یہ تہذیبیں ایک دوسرے میں مدغم نہیں ہو سکتیں۔ (ایضاً)

آپ نے غور فرمایا، عزیزانِ من! کہ مسلمانوں کے متعلق، ہندوستان کے ہندوؤں کے عزائم کیا تھے؟ مولانا حالیؔ

اکال الامم

نے بھارت کو "اکال الامم" کہا ہے۔ یعنی وہ کالی دیوی جو ان تمام قوموں کو نگل گئی جو زمانہ قبل از تاریخ سے لے کر مسلمانوں کی آمد تک، باہر سے آئی تھیں۔ جب وہ قومیں ہندوستان میں آئی تھیں تو ان کا جداگانہ تشخص، جداگانہ قومیت، جداگانہ مذہب، جداگانہ تہذیب تھی، لیکن اس کے بعد دیکھئے کہ ان کے جداگانہ وجود کا نشان تک اس طرح مٹ گیا گویا وہ کبھی دنیا میں موجود ہی نہ تھیں۔ وہ سب ہندو بن گئیں لیکن ان سب میں مسلمان سخت ہڈی کے نکلے۔ یہ ہندوؤں کی تمام چالوں کے باوجود ان میں جذب نہ ہوئے اور ان کی یہی سخت جانی تھی جو ہندو کے لئے خارِ پہلو بن رہی تھی۔ مہاتما جی اور ان کے چیلوں کی مسلمانوں کے غم میں یہ تمام دردناک آہیں، اور جگر گداز نالے، اسی کلیجے کی کھٹک کا نتیجہ تھیں۔ پہلے انہیں یہ غم ستا رہا تھا کہ یہ ایک الگ قوم کی حیثیت سے زندہ کیوں ہیں اور اب یہ صدمہ مار رہا تھا کہ یہ شکار ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے۔ چنانچہ ان کے بڑے بڑے مہا پرش، اپنی جاتی کے سپوتوں سے للکار للکار کر کہہ رہے تھے کہ دیکھنا، یہ کہیں جانے نہ پائیں۔ سردار پٹیل نے، مارچ ۱۹۴۷ء میں احمد آباد میں ایک تقریر کے دوران کہا۔

> جو لوگ ایک جداگانہ قومیت کے متمنی ہیں، ان میں سے نوّے فیصد وہ ہیں جو اس ملک کی مٹی کی پیداوار ہیں۔ اس لئے اگر یہ لوگ پھر اپنی اصل میں جذب نہیں کئے جا سکتے تو یہ اُن لوگوں کا قصور ہے جن سے نکل کر یہ لوگ الگ ہوئے تھے۔ (طلوعِ اسلام۔ اپریل ۱۹۴۷ء)

یہ حضرات اس قسم کی تقاریر سے ہندو سپوتوں کو مشتعل کر رہے تھے جس کا نتیجہ یہ تھا کہ انہوں نے مختلف مقامات

مسلمانوں کا قتلِ عام

پر مسلمانوں کو قتل و غارت کرنا شروع کر دیا۔ اس سلسلہ میں مسلمانوں پر کس قدر تشدد کیا جاتا تھا، اس کی تفصیل طول طویل ہے۔ (مسلم لیگ کی طرف سے متعین کردہ، پیرپور کمیٹی کی رپورٹ اس پر شاہد تھی)۔ میں اس مقام پر صرف ایک واقعہ کے تذکرہ پہ اکتفا کروں گا۔ ۱۹۳۸ء میں، سی۔ پی کے بسواچاندور میں، ہندو بلوائیوں نے مسلمانوں کو بُری طرح سے قتل کیا اور لوٹا۔ اور وہاں کی کانگرسی حکومت نے، خود مسلمانوں کو گرفتار کر کے انہیں جیل میں ٹھونس دیا۔ اس سلسلہ میں ان پر کس قدر تشدد کیا گیا اس کے متعلق، وہاں کے سیشن جج نے اپنے فیصلے میں لکھا تھا۔

> تمام مسلمانوں کی ذلت کے ساتھ شہر کی سڑکوں پر تشہیر کی گئی۔ اور پھر اسکول کے ایک کمرے میں ۱۵۵ مسلمان بند کر دیئے گئے۔ یہ کمرہ بیس فٹ لمبا اور بیس فٹ چوڑا تھا جس میں یہ مسلمان،

رات بھر مقفل رکھے گئے۔ ان لوگوں کی تشہیر کے لئے جب انہیں سڑکوں پر گھمایا گیا تو وہ دوپہر کا وقت تھا اور چونکہ یہ سخت ترین گرمی کا زمانہ تھا اس لئے اس وقت گرمی یقیناً زیادہ ہوگی جو مجسٹریٹ اس تشہیر کے وقت ساتھ تھا اس نے تسلیم کیا ہے کہ اس وقت اتنی شدید گرمی تھی کہ اس تشہیر میں کئی لوگوں کو قے آگئی ۔ ۔ ۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کو ذلت کے ساتھ برسرِ عام کھڑا کر کے ان کی جامہ تلاشی کرنے سے لے کر ۵۰ آدمیوں کو ان کے جیل بھیجنے کے وقت تک پولیس کا جو عمل رہا ہے اسے دیکھ کر آجکل کے نازی جرمنی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔

(مدینہ۔ بجنور ۲۵۔ بحوالہ طلوعِ اسلام ستمبر ۱۹۳۸ء)

یہ تھا کانگریسی حکومت کے تحت مسلمانوں کی اقلیت کا حشر!

(۵)

کہا یہ جاتا ہے ـــ اور خود اس زمانے کے مسلمان غدارانِ ملت، جو حصولِ پاکستان کی راہ میں سنگِ گراں بن کر حائل تھے، کہا کرتے تھے ـــ کہ ہندو وہاں اپنی حکومت قائم نہیں کرنا چاہتا تھا، جمہوری نظام قائم کرنا چاہتا تھا۔ میں یہاں اس بحث میں نہیں الجھنا چاہتا کہ اسلامی نقطۂ نگاہ سے خود مغربی جمہوریت ہی کس قدر ملعون و مردود نظامِ مملکت ہے۔ اگر مغربی نقطۂ نگاہ سے بھی دیکھا جائے، تو ہندوستان کی جمہوریت کچھ نرالے قسم کی ہوتی ـــ اور ہے۔

جمہوری نظام

ـــ مغربی انداز جمہوریت میں ہوتا یہ ہے کہ جو پارٹی آج اقلیت میں ہے، اس کے لئے امکان ہے کہ وہ کل کو اکثریت بن کر اپنی حکومت قائم کرلے۔ لیکن ہندوستان میں مسلمان اقلیت میں تھے اور چونکہ یہ اقلیت مذہب کی بنیاد پر تھی، اس لئے اس کے لئے اس کا امکان ہی نہیں تھا کہ یہ کبھی اکثریت بن کر اپنی حکومت قائم کرسکے۔ لہٰذا اسے مستقلاً ہندو اکثریت کی محکومی کی زندگی بسر کرنی پڑتی۔ ہندو کی محکومی کس قسم کی ہوتی، اس کا جواب ہم سے نہیں، خود وہاں کے اربابِ سیاست کی زبان سے سنیئے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے، اس ضمن میں لکھا تھا کہ

> در اصل جمہوری حکومت کے معنی یہ ہیں کہ اکثریت، اقلیت کو ڈرا کر اور دھمکا کر، اپنے قابو میں رکھنا چاہتی ہے۔
>
> (میری کہانی۔ جلد دوم۔ صفحہ ۵۵۴)

اس اکثریت کی حکومت کے تابع مسلمانوں پر کیا گزرتی، اس کے متعلق متحدہ قومیت کی سب سے بڑی مؤید جماعت ـــ جمعیت العلماء ہند ـــ کے سیکرٹری، مولانا احمد سعید (مرحوم) نے ۱۹۲۶ء میں کہا تھا کہ

> اسلامی حکومت کے زوال پر اس ملک میں ہندوؤں کی حکومت قائم ہو جاتی تو مسلمانوں کو چھٹی کا کھایا یاد آجاتا ـــ جو قوم موجودہ غلامی کی حالت میں یہ ستم ڈھا رہی ہے، حکمران بن کر خدا جانے

مسلمانوں کے ساتھ کیا کرتی۔ (الجمعیۃ۔ بابت ۱۰ جنوری ۱۹۲۶ء)

مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) کا نام تو آپ نے سنا ہوگا — یہ وہی بزرگوار ہیں جن کے نظریۂ متحدہ قومیت کی بنا پر علامہ اقبالؒ نے ان کے ماتھے پر وہ کلنک کا ٹیکہ لگایا تھا کہ اگر وہ اسے تسنیم و سلسبیل کے پانی سے بھی مل کر دھو رہے ہونگے تو وہ نہیں اترے گا۔ انہی مدنی صاحب نے ۱۹۲۶ء میں مولانا شوکت علی (مرحوم) کو ایک خط میں لکھا تھا۔

چونکہ ہندوستان میں مسلمان اقلیت میں ہیں اور ہندو اکثریت میں، اور ان کی اکثریت بھی غیر معمولی ہے اور تین اور ایک کی نسبت ہے اور ان کی یہ حالت ہے کہ آج تک ڈاکٹر مونجے صاحب یہی فرما رہے ہیں کہ "یہ سرزمین کسی مسلمان یا کسی فرقہ کی زمین نہیں ہے۔ یہاں جو راج قائم ہوگا وہ ہندو راج ہوگا۔ مجھے کروڑوں ہندو رضاکاروں کی ضرورت ہے۔" جو مظالم آئے دن یہاں دفتروں میں، شہروں میں اور ریاستوں میں کئے جا رہے ہیں۔ اور جس تعصب اور عدم رواداری کا ثبوت حسب تصریح جناب "ہندو دیوتا" گاندھی جی اور نہرو صاحب نے دیا ہے، ان کی بنا پر ہم کسی طرح بھی اپنے ابنائے وطن کیساتھ متحدہ قومیت نہیں بنا سکتے۔ (طلوعِ اسلام۔ بابت اپریل ۱۹۴۲ء)

[آسمان نے ایسا منظر بھی شاید ہی کبھی دیکھا ہو کہ جو لوگ چند سال پہلے ہندوؤں کی حکومت کے متعلق یہ کچھ کہہ رہے تھے، وہ خود اسی ملک میں، انہی ہندوؤں کی حکومت کے لئے مصروفِ جدوجہد ہو گئے اور جو مسلمان ان کے چنگل سے نکل کر اپنا آزاد مملکت قائم کرنے کے لئے کوشاں تھے، ان کی سخت مخالفت کرنے لگے۔ لیکن یہ ایک جداگانہ کہانی ہے جسے بیان کرنے کا یہ موقع نہیں۔ اس وقت تو صرف یہ دیکھئے کہ ہندو کیا ہے! انگریز کے ہندوستان سے چلے جانے کے بعد ہندوؤں کے عزائم کیا تھے، اس کا انکشاف قائداعظم نے دسمبر ۱۹۴۱ء میں آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے اجلاس میں ان الفاظ میں کیا تھا۔

ہندوؤں کے عزائم

ساورکر (صدر ہندو مہاسبھا) کی اسکیم یہ ہے کہ جب انگریز کے جانے کے بعد، میدانی، بحری اور فضائی فوج میں ہندوؤں کو ۷۵ فیصد حصہ مل جائے گا تو پھر ہندو راج قائم کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ ان مسلمانوں کا کیا حشر ہوگا جو شمال مغرب اور شمال مشرق میں بستے ہیں۔ ان کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ سرحدوں پر ہندو فوج اس طرح بٹھا دی جائے گی جس طرح اب برطانوی فوج متعین ہے۔ اور یہ فوج اس کا خیال رکھے گی کہ مسلمان سر نہ اٹھا سکیں۔

یہ تھا برادرانِ انگریز! وہ ہندو جس کے پنجۂ استبداد سے نجات حاصل کرنے کے لئے، ملتِ اسلامیہ کے مجاہد اعظم محمد علی جناح نے دس سال تک مسلسل لڑائی لڑی اور ہندو اور انگریزوں کے علاوہ خود نیشنلسٹ مسلمانوں —

پاکستان بن جانے کے بعد

جمعیت العلماء ــــ جمعیت الانصار۔ سرحد کے سرخ پوش، مجلس احرار، جماعت اسلامی۔ اور یونینیسٹ پارٹی ــــ کی مسلسل مخالفت کے علی الرغم، پاکستان حاصل کر لیا۔ اس پر ان مخالفین کے دلوں کے اضطراب کا کیا عالم تھا، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ایک طرف، ڈاکٹر شیام پرشاد مکرجی یہ کہہ رہا تھا کہ

> ہمارا نصب العین یہ ہونا چاہیئے کہ پاکستان کو پھر سے ہندوستان کا حصہ بنا لیا جائے۔ اس حقیقت کے متعلق میرے دل میں ذرا سا بھی شبہ نہیں کہ ایسا ہو کر رہیگا، خواہ یہ معاشی دباؤ سے ہو یا سیاسی دباؤ سے، یا اس کے لئے دیگر ذرائع استعمال کرنے پڑیں۔ (آرگنائزر ۔ ۲ ستمبر)

دوسری طرف سے دیوان چمن لال جیسے (بظاہر اعتدال پسند ہندو) یہ کہہ کر ہندوؤں کی ڈھارس بندھا رہے تھے کہ

> میں ناامید ہونے والوں میں سے نہیں ہوں' اس لئے مجھے یقین ہے کہ تقسیمِ ہند ایک عارضی سا حادثہ ہے اس کے باوجود ہمیں تیس کروڑ ہندوؤں کو اس مقصد کے حصول کے لئے جان تک دے دینے کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ یہ بہت غلط ہوگا کہ ہم (اپنی قوم کو) امن اور شانتی کی لوریاں دیدے کر اسی طرح سلائے رکھیں جس طرح ہم نے انہیں اس وقت تک سلائے رکھا اور جس کا نتیجہ اب ہمارے سامنے ہے۔ ہم میں بنیادی نقص یہ ہے کہ ہم ضرورت سے زیادہ امن پسند واقع ہوئے ہیں۔ (ایضاً)

اور تو اور، جب تقسیمِ ہند کا بل، منظوری کے لئے برطانوی پارلیمان میں پیش ہوا تو برطانیہ کے وزیر اعظم، لارڈ اٹیلی (جو اس وقت مسٹر اٹیلی تھے) اپنی تقریر میں فرما رہے تھے کہ

> ہندوستان تقسیم ہو رہا ہے لیکن مجھے امید واثق ہے کہ یہ تقسیم زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکے گی اور یہ دونوں مملکتیں جنہیں ہم اس وقت الگ کر رہے ہیں، ایک دن پھر آپس میں مل کر رہیں گی۔

پاکستان ــ انگریز، کانگریس اور مسلم لیگ کے باہمی سمجھوتے سے وجود میں آیا تھا۔ اس سلسلہ میں آپ نے اس سمجھوتہ کے ایک فریق (انگریز) کے خیالات سُن لئے۔ اب کانگریس کی سنیئے۔ ۳ جون ۱۹۴۷ء کو تقسیمِ ہند کا اعلان ہوا، اور ۱۴ جون کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے حسب ذیل ریزولیوشن پاس کیا۔

> آل انڈیا کانگریس کمیٹی کو پورا پورا یقین ہے کہ جب موجودہ جذبات کی شدت میں کمی آجائے گی تو ہندوستان کے مسئلہ کا حل، صحیح صحیح پس منظر میں دریافت کر لیا جائے گا اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے دو الگ الگ قومیں ہونے کا باطل نظریہ مردود قرار پا جائے گا۔

کانگریس کی طرف سے، تقسیمِ ہند کے فیصلہ پر دستخط پنڈت جواہر لال نہرو نے کئے تھے۔ وہ ایک طرف اس فیصلہ پر دستخط کر رہے تھے اور دوسری طرف اپنی قوم سے کہہ رہے تھے کہ

ہماری اسکیم یہ ہے کہ ہم اس وقت جناح ؒ کو پاکستان بنا لینے دیں اور اسکے بعد معاشی طور پر یا دیگر انداز سے ایسے حالات پیدا کرتے جائیں جن سے مجبور ہو کر مسلمان گھٹنوں کے بل جھک کر ہم سے درخواست کرے کہ ہمیں پھر سے ہندوستان میں مدغم کر لیجئے۔ (پاکستان فیسز انڈیا۔ صفحہ ۹۹)

اس کے بعد راجہ مہندر پرتاپ نے (سنہ ۱۹۶۵ء میں) اپنی قوم کو مشورہ دیا کہ

جب تک پاکستان کا وجود ختم نہیں ہو جاتا ہمارا ملک کوئی ترقی نہیں کر سکتا۔ حالات اس طرح بدل رہے ہیں کہ مجھے یقین ہوتا چلا جا رہا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان میں جنگ لاینفک ہو گئی ہے۔ بنابریں میں حکومت ہند کو مشورہ دوں گا کہ وہ افغانستان کو اپنے ساتھ ملا کر پاکستان کو ختم کر دے۔

(ویر بھارت ۔ ۱۷/۵/۲۱)

سوشلسٹ اپنے آپ کو بڑا منصف مزاج اور تعصب سے بالا قرار دیا کرتے ہیں۔ لیکن جہاں تک مسلمانوں کی مخالفت کا تعلق ہے، اس میں ہندو مہاسبھا اور سوشلسٹ پارٹی میں کوئی فرق نہیں۔ چنانچہ اس پارٹی کے لیڈر، ڈاکٹر رام منوہر لوہیا نے اپنی کتاب "اگلا قدم" میں لکھا تھا کہ

ہم زیادہ عرصہ تک انتظار نہیں کر سکتے۔ شاید دو تین سال کے عرصہ ہی میں امرتسر اور پاکستان کی درمیانی حد فاصل مٹ جائے گی۔ ہمیں پاکستان کے اس زہر کو ختم کر کے تقسیم ہند کو معدوم کر دینا چاہیئے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ مصنوعی تقسیم ختم ہو جائے گی اور پاکستان اور ہندوستان پھر سے ایک ملک ہو جائیں گے۔

میرا خیال ہے کہ آپ اس انتظار میں ہوں گے کہ اس باب میں "بڑے میاں" (گاندھی جی) نے کیا دیکھیاں دیا ہے۔ وہ بھی سن لیجئے۔ انہوں نے پاکستان بننے کے تین دن پہلے کہا تھا کہ

اگر سارا ہندوستان جل کر راکھ ہو جائے، ہم پھر بھی مطالبہ پاکستان منظور نہیں کریں گے خواہ مسلمان اسے بزور شمشیر ہی کیوں نہ طلب کریں۔

(دی ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا۔ صفحہ ۱۹۱۔ مصنفہ ای۔ ڈبلیو۔ آر۔ لومبی)

———(۰)———

یہ اس داستان کا پہلا باب ہے۔ اب دوسرا باب ملاحظہ فرمائیے کہ تشکیل پاکستان کے بعد ہندو کس روپ میں سامنے آیا۔ اس روپ کے دو حصے ہیں۔ ایک یہ کہ ہندو نے خود اپنے ہاں کے بسنے والے مسلمانوں کے ساتھ کیا کیا

اور دوسرے یہ کہ پاکستان کی طرف آنے والے مسلمانوں کو کس طرح اپنی ہوسِ خون آشامی کی تسکین کا سامان بنایا۔

(۲)

باب دوم

(تشکیلِ پاکستان کے بعد)

مسلمانوں کا قتلِ عام

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء (بروز جمعۃ الوداع) ہندوستان اور پاکستان کی دو الگ الگ مملکتوں کا وجود عمل میں آیا اور اس کے دو روز بعد مسلمانوں نے آزادی کی فضا میں پہلی عید منائی۔ لیکن ہنوز نمازِ عید کی تکبیریں بھی پوری نہیں ہوئی تھیں کہ مشرقی پنجاب اور اس کی ریاستوں — نابھہ، پٹیالہ، کپورتھلہ، فریدکوٹ سے مسلمانوں کے منظم اور وسیع پیمانے پر قتلِ عام کی خبریں آنی شروع ہو گئیں۔ اس قتل و غارت گری میں ہزاروں مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ عورتوں کو اغوا کیا گیا۔ بچوں کو سنگینوں کی نوک پر اچھالا گیا۔ عصمت دری کے واقعات عام ہونے لگے۔ بعض شہروں میں مردوں کو ختم کر کے، نوجوان عورتوں کے برہنہ جلوس نکالے گئے۔ چند ہی ہفتوں کے اندر اندر تقریباً پانچ لاکھ مسلمان قتل کر دیئے گئے۔ اس کے بعد قتل و غارت گری کی اس آگ کا رُخ دہلی کی طرف پھرا اور ہندوستان کے دارالسلطنت میں پورا ستمبر کا مہینہ اس ستم کے قتلِ عام میں گزرا۔ جس کی مثال تاریخ کے اوراق میں کہیں نہیں ملتی۔ ایک اندازہ کے مطابق اس خونی تماشہ میں بھارت میں قریب دس لاکھ مسلمان قتل و غارت گری کی نذر ہو گئے۔ اور قریب ایک کروڑ مسلمان، انتہائی کس مپرسی کے عالم میں، کسی نہ کسی طرح، جان بچا کر پاکستان پہنچ پائے۔ ان تارکینِ وطن کے ساتھ راستے میں کیا گزری، اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگائیے، کہ نومبر ۱۹۴۷ء میں، ضلع انبالہ کے کرالی کیمپ سے پانچ ہزار پناہ گزینوں کا قافلہ لائلپور کے قریب پہنچا۔ ان میں سے دو ہزار مختلف بیماریوں میں مبتلا تھے۔ ان میں ہیضہ کا مرض عام تھا۔ اس کیمپ میں انہیں جو آٹا کھانے کو دیا جاتا تھا جب اس کا کیمیاوی تجزیہ کیا گیا تو اس میں سنبلا کھوتھا کا زہر ملا ہوا تھا۔ ایک گاڑی ۱۱ نومبر کو دہلی سے لاہور پہنچی تو اس میں سفر کرنے والی عورتوں اور لڑکیوں نے بتایا کہ حکومت ہند نے جو سپاہی ان کی حفاظت کے لئے گاڑی میں متعین کئے تھے، انہوں نے کس طرح راستے میں ان کی عصمت دری کی۔ ایک ٹرین میں قریب ڈیڑھ ہزار پناہ گزین دہلی سے آ رہے تھے۔ امرتسر کے قریب ان سب کو ختم کر دیا گیا۔ یہ سب کچھ ہندوستان میں، ہندوستانی حکومت کی طرف سے، وہاں سے آنے والے مسلمانوں کے خلاف ہو رہا تھا۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لئے ہندوؤں کی طرف سے کیا واویلا مچایا جا رہا تھا۔ ان کی طرف سے مسلسل چیخ و پکار ہو رہی تھی کہ مسلمانوں نے ہندوؤں کو تباہ و برباد کر دیا ہے، ان کے گھر لوٹ لئے ہیں، ان کی عورتوں کو اغوا کر لیا ہے۔ یہ تھا وہ واویلا جس کی طرف

اشارہ کرنے کے بعد، مہاتما گاندھی نے ۲۶ ستمبر ۱۹۴۷ء کی اپنی شام کی پرارتھنا کی میٹنگ میں کہا تھا کہ

اگرچہ میں نے جنگ کی ہمیشہ مخالفت کی ہے لیکن اگر اس سلسلہ میں پاکستان سے انصاف حاصل کرنے کا کوئی اور طریق کارگر نہ ہوا تو پھر اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوگا کہ ہندوستان، پاکستان کے خلاف جنگ کرے۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی اپنے ایک بیان میں کہا تھا کہ "میں چاہتا تھا کہ اپنی فوجیں پاکستان پر حملہ کرنے کے لئے بھیج دوں۔ لیکن ہندوستان کے اندرونی خلفشار نے اس کی اجازت نہ دی"

یہ تھا ہندو لیڈروں کی طرف سے، مسلمانوں کو تباہ و برباد کر دینے والے قیامت خیز واقعات کا جواب! خدا خدا کر کے، کسی نہ کسی طرح یہ آگ فرو ہوئی تو ۱۹۵۰ء میں بنگال میں فسادات شروع کرا دیئے گئے۔ جس کے نتیجہ میں، قریب ڈیڑھ لاکھ مسلمان، اپنا سب کچھ وہیں چھوڑ کر، نہایت کس مپرسی کی حالت میں، مشرقی بنگال کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے۔

لیکن قبل اس کے کہ ہم اس سمت میں آگے بڑھیں اور دیکھیں کہ ہندو نے پاکستان کے خلاف اپنے عزائم کو بروئے کار لانے کے سلسلہ میں کیا کیا، ہمیں پیچھے مڑ کر یہ دیکھنا چاہیئے کہ اس نے خود ہندوستان میں، اپنی "قوم" کے افراد (مسلمانوں) کے ساتھ کیا کیا۔

ہندوؤں نے اپنی حکومت قائم ہونے کے بعد، پہلا کام یہ کیا کہ سومنات کی جامع مسجد کو، جو ایک ہزار سال سے وہاں ایستادہ تھی، مسمار کر کے اس کی جگہ مندر بنا دیا۔ یہ تقریب بڑے جوش و خروش سے منائی گئی اور اس "مقدس رسم" کی ادائیگی کے لئے، سیکولر حکومت کے صدر، بابو راجندر پرشاد کو بلایا گیا[1]۔ اس کے بعد جو وہاں مسجدیں ڈھانے کی طرح پڑی ہے، تو پھر ایسے واقعات کا کوئی انت شمار ہی نہیں رہا۔ حالانکہ تقسیم ملک سے متعلق آئین میں، اقلیتوں کے مذہب اور ثقافت کی حفاظت دی گئی تھی۔ اخبار مدینہ کی ۲۸ جولائی ۱۹۶۵ء میں شائع ہونیوالی ایک خبر کے مطابق اُس وقت تک ایک شہر لدھیانہ کی ۱۱۷ مساجد میں سے ۹۰ میں گردوارے بن چکے تھے۔ ۱۵ میں مندر۔ اور باقیوں میں رہائش۔ (طلوع اسلام۔ فروری ۱۹۶۶ء)

اسلامک کلچر کا خاتمہ

جہاں تک ثقافت کا تعلق ہے۔ ہندوستان کے پہلے جشن آزادی کی تقریب پر، یو۔پی کانگریس کمیٹی کے صدر اور وہاں کی اسمبلی کے اسپیکر، مسٹر ٹنڈن نے

---

[1] آپ کو معلوم ہے کہ ہم (پاکستان کے مسلمانوں) نے اسکا جواب کیسے دیا تھا؟ یہ تقریب ۱۱ مئی کو منعقد ہوئی تھی۔ یہاں کے مسلمانوں نے فیصلہ کیا تھا کہ ۱۱ مئی کو قوم میں جس قدر لڑکے پیدا ہوں ان کا نام محمود رکھا جائے۔ چنانچہ ایسا کرنے سے ہم خوش ہو گئے کہ ہماری قوم میں اتنے محمود پیدا ہو گئے ہیں۔ کس قدر خود فریب واقع ہوئی ہے یہ قوم!!

پورے جوش و خروش سے کہا کہ

ہندوستان یونین میں، جداگانہ زبان اور جداگانہ کلچر کی آواز کہیں سے نہیں نکلنی چاہیئے۔ جو لوگ کسی خاص فرقے کے لئے جداگانہ زبان یا کلچر کی حمایت کرتے ہوں ان کے لئے ہندوستان میں کوئی جگہ نہیں۔ اگر یہ لوگ اپنا نظریہ نہ بدل سکیں تو انہیں ہندوستان چھوڑ کر کہیں اور چلے جانا چاہیئے۔ مذہب اور کلچر دو مختلف چیزیں ہیں۔ چین جاپان اور دیگر ممالک میں بھی مسلمان بستے ہیں، نہ انکی جداگانہ زبان ہے نہ جداگانہ کلچر۔ ان کا کلچر وہی ہے جو ان کی مادرِ وطن کا کلچر ہے۔ اگر مسلمان ہندوستان میں رہنے کے خواہشمند ہیں تو انہیں ہندی کو بطور زبان اور ناگری کو بطور رسم الخط اختیار کرنا ہوگا انہیں اپنی تہذیب اور تمدن کے لئے عرب یا پاکستان کی طرف نہیں دیکھنا چاہیئے بلکہ بھارت ورش کے کلچر کو اپنا کلچر بنانا چاہیئے۔　　　　(ہندوستان ٹائمز ۸ ستمبر ۶۷ء)

سی۔ پی کے وزیرِ اعظم مسٹر شکلا نے بھی یہی کچھ فرمایا اور کہا کہ

میں، ان مسلمانوں کو جن کے دماغ میں ابھی تک مسلم لیگی ذہنیت موجود ہے، یہ چیلنج دینا چاہتا ہوں کہ آج ایک زبان اور ایک تہذیب کے خلاف جو کوششیں ہو رہی ہیں انہیں نہ تو ہم برداشت کرینگے اور نہ ہی کامیاب ہونے دینگے۔　　　　(ملاپ ۱۷ ستمبر ۱۲ء)

اور انڈین پارلیمنٹ کے اسپیکر، مسٹر مولنکر نے ایک جلسے میں کہا کہ

ہم اس وقت سخت کشمکش میں مبتلا ہیں۔ اگر اس کشمکش کا نتیجہ یہ نکلے کہ کسی ایک فرقہ کی زبان اور تمدن تباہ ہو تو اصول کا تقاضا یہ ہے کہ اقلیت کے فرقہ کی زبان اور تمدن کو تباہ ہو جانا چاہیئے ... اقلیت کے فرقہ کو اس کا احساس ہونا چاہیئے کہ وہ ایک بڑے خاندان کا ممبر ہے اور اسے بڑے خاندان میں اپنی ہستی کو ضم کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

(الجمعیتہ، دہلی۔ بحوالہ طلوعِ اسلام۔ بابت فروری ۴۹ء)

جب مسلمانوں نے ہندوؤں کے معتدل مزاج لیڈروں کی توجہ ان تقاریر کی طرف دلائی تو پنڈت سندر لال جیسے لیڈر نے، جو بڑے فخر سے اپنے آپ کو ایک طرح کا مسلمان کہا کرتے ہیں، جامع مسجد دہلی میں مسلمانوں سے کہا کہ اگر ان کے ساتھ کسی قسم کی سختی ہوتی ہے تو انہیں اس سختی کو ان لوگوں کی طرف سے کفارہ سمجھ کر برداشت کر لینا چاہیئے جنہوں نے پاکستان بنوایا تھا۔ آخر تمہیں میں سے وہ لوگ تھے جو "لے کے رہیں گے پاکستان" اور "بٹ کے رہیگا ہندوستان" کے نعرے لگایا کرتے تھے۔　　　　(صدق ۲۸ ستمبر ۱۷ء)

یہ ۱۹۴۷ء کی باتیں تھیں۔ اور ۱۹۶۷ء میں ہندو مہا سبھا نے الیکشن کے سلسلہ میں جو اپنا منشور شائع

کیا اس میں واضح الفاظ میں لکھا کہ

> مہا سبھا، دستور میں اس قسم کی ترمیمات کے حق میں ہے جو ہندو کلچر کی روایات کے مطابق ہوں اور جس کے نتیجے میں ملک صحیح معنوں میں ایک جمہوری ہندو ریاست بن سکے۔ اگرچہ اقلیتیں کلچر اور مذہب کے معاملہ میں آزاد ہوں گی لیکن انہیں ہندو قومیت کے خاص دھارے میں سمو جانا چاہیئے اور مذہب اور کلچر کے نام پر علیحدہ قومیت کے تصور کو خیرباد کہہ دینا چاہیئے۔
>
> (مدینہ بجنور ۲۵ ۱/۴)

یہ کچھ وہاں موجودہ مسلمانوں کے ساتھ ہو رہا ہے۔ جہاں تک وہاں کے مسلمانوں کی آنے والی نسلوں کا تعلق ہے ان کے لئے نظام تعلیم ایسا وضع کر دیا گیا ہے کہ جس سے وہ بھول جائیں کہ وہ کسی جداگانہ قوم کے افراد ہیں۔ (یہی گاندھی جی کی واردھا کی تعلیمی اسکیم کا مقصد تھا)۔ اس سلسلہ میں کوئی دو سال اُدھر، مولانا ابوالحسن ندوی نے ہندوستان میں رہنے والے اپنے ایمانی بھائیوں کے نام ایک اپیل میں کہا تھا کہ

> دل پر پتھر رکھ کر لیکن آنکھوں کی پٹی کھول کر یہ بات عرض کرنی پڑتی ہے کہ اب اس بات کے سمجھنے میں کسی دوربینی یا فراست ایمانی کی ضرورت نہیں کہ سرکاری اسکولوں میں جو نصاب (بالخصوص ہندی اور سنسکرت میں پڑھایا جاتا ہے) اس کے بعد کسی مسلمان بچے کا کم سے کم معنی میں بھی مسلمان رہنا عقلاً اسی طرح ممکن نہیں جیسے دریا میں کودنے اور غوطہ لگانے کے بعد جسم کا خشک رہنا اور دامن کا تر نہ ہونا ممکن نہیں۔ (طلوع اسلام ۔ نومبر ۱۹۶۹ء)

یہ کچھ وہاں کے مسلمانوں کے ساتھ ذہنی اور نفسیاتی طور پر کیا جا رہا ہے۔ اس کے ساتھ وہاں متواتر تیئس سال سے جو فسادات کا سلسلہ جاری ہے اور جن میں مسلمانوں کی جان، مال، عزت، آبرو عصمت

فسادات

کچھ بھی محفوظ نہیں رہتی، ان کا صد و شمار ہی نہیں۔ سید بدرالدجیٰ، مغربی بنگال کے ایک مسلم راہنما ہیں۔ بہت پرانے کانگریسی۔ آزادی کی جنگ میں ہندوؤں کے چوٹی کے لیڈروں کے ہمراہ شانہ بشانہ لڑنے اور جیل جانے والے۔ اس وقت (۱۹۶۹ء میں) وہ وہاں کی مرکزی پارلیمان کے رکن ہیں۔ انہوں نے، کوئی دو سال اُدھر، پارلیمان کے بھرے اجلاس میں ایک طول طویل تقریر میں تفصیل سے بتایا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا کیا حشر ہو رہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ آزادی کو حاصل کئے انیس سال ہوئے ہیں۔ ان انیس سالوں میں (مسلمانوں کو ختم کرنے کے لئے) پولیس کی بے امتیاز فائرنگ انگریزوں کی ڈیڑھ سو سالہ روایات کو پیچھے چھوڑ گئی ہے۔ پورے ملک میں قتل و غارت گری جھوٹی مقابلہ دہانیاں، لوٹ مار کے دلدوز مناظر، ہزاروں مسلمانوں کا قتل عام، بلاکسی امتیاز کے لاکھوں کی گرفتاری۔ آسام اور مغربی بنگال سے بے دخلیاں اور اس قسم کے دوسرے

ہزار ہا واقعات مسلمانوں سے موجودہ سیکولر حکومت کے "جانبدارانہ" سلوک کے ثبوت ہیں ۔ انہوں نے اپنی تقریر میں انکشاف کیا کہ پاکستان اور بھارت کی جنگ کے دوران، پچاس ہزار سے زیادہ مسلمانوں کو پاکستان کا جاسوس قرار دے کر غداری کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا تھا ۔ مغربی بنگال میں ۴۵ ہزار پاکستانی موجود تھے ۔ ان میں سے دس ہزار نظر بند کر لئے گئے جو مسلمان تھے ۔ ہندوؤں کو پاکستانی ہونے کے باوجود کچھ نہیں کہا گیا ۔

(طلوع اسلام ۔ جولائی ۱۹۶۶ء)

جہاں تک فسادات کا تعلق ہے، ان کی کیفیت بڑی دلدوز اور جگر سوز ہے ۔ کلکتہ سے شائع ہونے والے اخبار (NOW) کی ۱۲ جنوری ۱۹۶۸ء کی اشاعت میں ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں منجملہ دیگر امور کہا گیا تھا ۔

> تقسیم ہند کے بعد کم از کم پانچسو فرقہ وارانہ فسادات ہوئے ہیں جن میں ہلاک ہونے والوں کی تعداد پچاس ہزار سے بھی زیادہ ہے ۔ لیکن یہ تخمینہ بہت پرانا ہے اور نظر ثانی کا محتاج، یہ تمام فسادات سیکولرازم کے پردے میں ہوتے ہیں اور یہ سیکولرازم اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس برہمن ذہنیت کی حفاظت کی جائے جس کی نمائندگی جن سنگھ اور آر ۔ ایس ۔ ایس جیسی فاشسٹ جماعتیں کر رہی ہیں ۔ ظاہر میں جن سنگھ فساد کراتی ہے لیکن پس پردہ اس کو کانگریس کی پوری تائید حاصل ہوتی ہے ۔ اس سلسلہ میں مسٹر نراد ۔ سی ۔ چودھری لکھتا ہے کہ "واقعہ یہ ہے کہ ہندو روایت جس قدر متشدد آج ہے اتنی آزادی کے وقت نہ تھی ۔ اور جیسے جیسے وقت گذر رہا ہے، اس میں مسلمانوں کے بارے میں، اور بھی زیادہ شدت آرہی ہے ۔"
>
> (بحوالہ ۔ ایشیا ۔ ۲۱/۶/۶۸)

۱۹۶۸ء میں بھارت کے وزیر داخلہ نے اپنی رپورٹ میں تسلیم کیا تھا کہ ملک کے مختلف حصوں میں جو فسادات ہوئے ہیں، ان کی تعداد ۱۹۶۶ء میں (۱۳۳) اور ۱۹۶۷ء میں (۲۶۷) تھی ۔ ۱۹۶۸ء میں جو اعداد و شمار شائع ہوئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سال کے صرف چار ماہ میں مسلمانوں کے خلاف (۱۰۳) فسادات ہو چکے ہیں ۔ خونریزی کا اندازہ اس سے لگایئے کہ ۱۹۶۵-۶۶ء تک مقتولین کی تعداد کا جو اوسط تھا، ۱۹۶۸ء کے صرف پہلے ۹ ماہ میں مقتولوں کی تعداد اس سے دگنی ہو چکی تھی ۔ (بحوالہ ایشیا ۔ ۲۱/۶/۶۸)

پچھلے دنوں (اوائل ۱۹۷۱ء میں) راولپنڈی سے شائع ہونے والے، ہفتہ وار جریدہ ھلال، میں ایک صاحب، این ۔ بی ۔ نقوی کا ایک مبسوط مقالہ متعدد اقساط میں شائع ہوا تھا جس میں ان خونریزیوں اور فساد انگیزیوں کی الم انگیز داستانیں تفصیل سے بیان کی گئی تھیں جو تقسیم ہند کے بعد، ہندوستان کے مسلمانوں

فسادات کی لرزہ انگیز تفصیلات

کے خلاف برپا ہوئیں۔ (یہ مضمون ایک انگریزی پمفلٹ کا ترجمہ تھا جسے معارف لمیٹڈ کراچی نے شائع کیا تھا) ہم اس پُر از معلومات مقالہ کے جستہ جستہ مقامات، درج ذیل کرتے ہیں۔

(۱) "بھارتی لوک سبھا کے ایک رکن اسحاق سنبھلی کے مطابق ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے لے کر ۱۹۶۷ء کے آخر تک بھارت میں ساڑھے سات ہزار مسلم کش فسادات ہوئے۔ یعنی بھارت نے اپنی آزادی کے پہلے دن سے مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیل کر اپنی 'آزادی' کی ابتداء کی تھی۔ بھارت کی وزارتِ داخلہ کی ایک سالانہ رپورٹ کے مطابق ۱۹۶۸ء میں ملک بھر میں تین سو چھیالیس فسادات ہوئے۔ ۱۹۶۹ء میں یہ تعداد بڑھ کر پانچسو انیس تک پہنچ گئی۔ ہزاروں مسلمان موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ اس خونِ ناحق پر ایک ممتاز بھارتی مبصر ایس مل گاؤنکر یہ کہنے پر مجبور ہوا کہ "اس سال فرقہ وارانہ کشمکش کے سیاہ ترین بارہ ماہ گزرے"۔ مسلم کش فسادات کی رفتار یہ ہے کہ لوک سبھا کے ایک ممبر جیوتر موئی باسو کے مطابق ہر چوبیس گھنٹے بعد بھارت میں ایک فرقہ وارانہ فساد رونما ہوتا ہے۔

حالیہ برسوں میں بھارت کے بڑے بڑے شہروں میں ہونیوالے فسادات کا ماحصل مسلمانوں کو قتل کرنے کے علاوہ اُن کے مال اسباب کا لوٹنا اور ان کی جائیدادوں کو آگ لگانا رہا ہے۔ اب ہر سن اور ہر شہر کی مثالیں گنتے چلیئے۔ جبل پور (۱۹۶۱ء) کلکتہ، جمشید پور اور رڑکیلا (۱۹۶۴ء) رانچی اور سرینگر (۱۹۶۷ء) اندور اور احمد آباد (۱۹۶۹ء) اور بھیونڈی اور مہاراشٹر کا پورا صوبہ (۱۹۷۰ء) تشدد کے ان تمام واقعات کی بنیادی بات یہی رہی کہ ـــ خونِ مسلم کی ارزانی ہوئی۔ اُن کا مال و اسباب لوٹا گیا ـــ اور ان کی جائیدادوں کو آگ لگا کر تباہ کیا گیا ـــ اور دوسری خاص بات یہ ہے کہ بھارت کا قانون حسبِ دستور اندھا بنا رہا۔ اس نے کسی ہندو مجرم کو بیڑیاں پہنا کر دار و رسن تک نہ پہنچایا۔"

(۲) "ہندوستان ٹائمز" کا نامہ نگار رسبرتا بینرجی فسادات کی مجموعی صورتِ حال کے بارے میں یکم نومبر ۱۹۶۹ء کی اشاعت میں لکھتا ہے: "ملک میں جو کچھ ہو رہا ہے' میں حیران ہوں کہ لوگوں کا وہ محدود طبقہ جو نسلی فسادات کے خلاف ہے، اس سے تجاہلِ عارفانہ سے کام کیوں لے رہا ہے۔ میں احمد آباد سے یہ تاثر لے کر لوٹا ہوں کہ وہاں جو کچھ ہوا ہے اس کا مقابلہ بآسانی ہٹلر کے جرمنی کے ان منصوبوں سے ہو سکتا ہے جو یہودیوں کو تباہ و برباد کرنے کے لئے تیار کئے گئے تھے۔ یا امریکہ کے انتہائی جنوبی علاقے میں جن طریقوں سے سیاہ فام لوگوں کو ختم کیا جا رہا ہے۔"

بھارتی ہندو، مسلم کش فساد کی تیاری کس طرح کرتے ہیں اور مسلمانوں کے قتلِ عام اور لوٹ مار کے منصوبے پر کس طرح عملدرآمد کرتے ہیں' اس کا جواب ذیل کے اقتباس سے مل جائے گا جو نئی دہلی سے شائع ہونے والے

انگریزی ہفت روزہ " لنک " کے ۱۲ مارچ ۱۹۷۰ء کے شمارے میں چھپنے والے ایک مضمون سے لیا گیا ہے ۔

" مسلمانوں کے قتلِ عام کا ایک اور قابلِ ذکر پہلو بھی ہے ۔ امرت ناتھ نے جسے حکمران جماعت کانگریس نے تحقیق و تفتیش کے لئے مقرر کیا تھا ، الٰہ آباد کے واقعات کے بارے میں اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ چاقو زنی کی وارداتیں اس وقت شروع ہوئیں جب افواہوں کے زور سے پھیلنے والا لوگوں کا پاگل پن ٹھنڈا پڑ چکا تھا ۔ چنانچہ جن آدمی جن پر چاقو سے حملہ کیا گیا وہ تمام نہ صرف مسلمان تھے بلکہ سوائے ایک دو کے ان سب کو کسی ایک خفیہ شخص نے اپنا نشانہ بنایا تھا ۔ ہر مضروب کے معدے میں اس طرح چاقو گھونپا گیا تھا کہ یا تو اس کی نوک پھیپھڑوں تک یا دل تک پہنچ جائے ۔ اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ اس طرح کی چاقو زنی باقاعدہ تربیت یافتہ آدمیوں ہی کا کام تھا ۔ رانچی ، میرٹھ اور کلکتہ میں ہونے والی وارداتوں سے بھی یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے "

منظم طریق

۱۳ ۔ " ہندوستان ٹائمز " کے نامہ نگار شبیر ما بیرجی نے رانچی ، اور کیلا ، ناگپور ، جبل پور ، اندور ، اورنگ آباد ، احمد آباد کے علاوہ بنگال (نزد کلکتہ) تک حالیہ فسادات کے بارے میں اپنی ایک رپورٹ میں لکھا :

" ہر جگہ فسادات کا انداز ایک ہی رہا لیکن بہانہ یہ نہیں تھا کہ ایسے ہی فسادات پاکستان میں بھی ہو رہے ہیں بلکہ ہر مرتبہ بات کا بتنگڑ بنا کر قتل و غارت گری ، آتشزنی اور لوٹ مار کی داستانیں دہرائی گئیں اور اس سلسلے میں سوچی سمجھی سکیموں اور منظم طریقوں پر عمل کیا گیا ۔ "

" بظاہر اتفاقیہ " واقعات جن کے متعلق خیال یہ ہے کہ ان کی وجہ سے احمد آباد میں فسادات کی آگ بھڑکی تھی ، شبیر تا بیرجی نے ان کے پس منظر سے پردہ اٹھایا اور اپنی رپورٹ میں لکھا ہے ۔

" اس قسم کے واقعات یہاں ہر سال ہوتے ہیں ۔ اس مرتبہ فساد کی وجہ یہ تھی کہ ہندوؤں کے ایک مندر سے کچھ ڈھور ڈنگر نکل کر مسلمانوں کے ایک عرس کی تقریب میں جا گھسے ۔ اس واقعہ کے فوراً بعد مبینہ طور پر تین سو آدمیوں کے ایک ہجوم نے جگن ناتھ مندر پر گیس کے بلبوں سے حملہ کر دیا ۔ لیکن جب میں مندر دیکھنے گیا تو میرے تعجب کی حد نہ رہی ۔ مندر کے صدر دروازے کے صرف تین شیشے ٹوٹے ہوئے تھے لیکن ان شیشوں کے پیچھے جو بت نصب تھے انہیں خراش تک نہ آئی تھی ۔ تین سو افراد جو گیس کے بلبوں سے مسلح ہوں کچھ نہ کچھ نقصان تو کر ہی سکتے ہیں ۔ اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس بات کا سراغ نہیں ملتا کہ وہ تین سو حملہ آور مسلمان تھے یا کون تھے ۔ دوسری بات یہ ہے کہ مندر پر مبینہ حملے کے فوراً بعد وہاں سے چھ میل کے فاصلے پر ایک مسلمان دھوبی کی دکان پر حملہ ہوا اور دکان تباہ کر دی گئی ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مندر پر مبینہ حملے کی خبر بہت ہی تیزی کے ساتھ پھیلی لیکن عجیب بات یہ ہے کہ جگن ناتھ مندر کے ساتھ والی بستی میں تشدد کا ایک بھی واقعہ نہ ہوا ۔ وہاں ہندو اور مسلمان فسادات کے پورے عرصے کے

دوران پُرامن طور پر رہتے رہے۔"

اب تبسرتا بیرجی ہی کی زبانی فسادات کی نوعیت کے بارے میں بھی سن لیجئے۔ وہ آگے چل کر لکھتا ہے۔

"کہا یہ جاتا ہے کہ جگن ناتھ مندر کے واقعہ سے لوگوں کے ذہن مشتعل ہوئے اور پھر وہی کچھ ہوا جو ایک ہجوم کی دیوانگی کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ لیکن ایک مشتعل ہجوم کی یہ نام نہاد دیوانگی ایک مخصوص اور منظم طریقے سے ظاہر ہوئی۔ مسلمانوں کے گھروں کا پتہ لگانے کے لئے انتخابی فہرستیں استعمال کی گئیں۔ اور پھر ان کے گھروں پر حملہ کرنے کے لئے وہاں مخصوص نشان لگا دیئے گئے۔ جب مسلمان دکانداروں پر حملہ کیا گیا تو اس بات کا خیال رکھا گیا کہ اگر دکان کسی ہندو کی ملکیت ہے تو پھر صرف سامان لوٹا گیا، عمارت کو بالکل نہیں چھیڑا گیا۔ لیکن اگر دکان کسی مسلمان کی ملکیت تھی اور دکاندار ہندو تھا، تو اس صورت میں دکاندار اور اس کے مال و اسباب کو ہاتھ تک نہیں لگایا گیا لیکن عمارت تباہ کر دی گئی ـــ یہ تھا ایک مشتعل ہجوم کا پاگل پن!

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ احمد آباد کے مشتعل ہندوؤں نے مسلمانوں پر حملوں کے دوران جو ابتدائی قسم کی فوجی چالیں اور حربی طریقے اپنائے تو انہوں نے لاشعوری طور پر ایسا کیا۔ لیکن یہ بھی ایک بے بنیاد بات ہے۔ ایسے لوگ جو فوجی تربیت سے کوسوں دور ہوں، بلا سوچے سمجھے فوجی چالیں کیسے اپنا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے قدم قدم پر بڑی عمدہ تنظیم اور تیز فہمی کا بھی ثبوت دیا۔

مسلمانوں کو احتیاط سے تلاش کرنے کے دوران ہندوؤں نے مشہور و معروف لوگوں پر خاص طور پر توجہ دی۔ جن کے متعلق یہ خیال تک نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ فرقہ پرست یا غدار ہو سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر جناب غلام رسول قریشی پر متواتر حملوں کی کیا وجہ بیان کی جا سکتی ہے؟"

مشتعل ہندوؤں نے قتل و غارت گری کے جو طریقے اختیار کئے۔ ان کے بارے میں سُبرتا بیرجی لکھتا ہے۔

"یہ بھی ایک خاص بات ہے کہ مشتعل ہجوم نے اپنی دیوانگی کے باوجود اتنی سمجھداری سے کام لیا کہ اس نے کچھ صنعتی ادارے جو مسلمانوں کی ملکیت تھے، تباہ کر دیئے۔ چنانچہ یہ یقین کر لینا کہ یہ فسادات ایک عام دیوانگی کا بے ساختہ نتیجہ تھے، سراسر غلط ہوگا۔ پہلے سے کی گئی منصوبہ بندی، تربیت اور تنظیم کے بغیر یہ سب کام اور اتنے وسیع پیمانے پر کئے نہیں جا سکتے۔ مجھے یقین ہے کہ احمد آباد کا پورا شہر مسلح ہندو فرقہ پرست جتھوں اغلباً راشٹریہ سیوک سنگھیوں کے ہاتھوں میں کئی روز تک رہا۔ اس سلسلے میں خاص بات یہ ہے کہ نہایت منظم اور باقاعدہ طریقے سے افواہیں پھیلائی گئیں۔ بلکہ یہ کام فسادات کے بعد بھی جاری رہا۔ معمولی واقعات کو اس طرح ہوا دی گئی کہ یہ ظاہر ہو سکے کہ مسلمان لڑنے مرنے پر آمادہ ہیں۔ احمد آباد میں یہ افواہ زوروں پر تھی کہ نیورا تری کے تہوار کے موقعہ پر مسلمانوں نے ہندوؤں کے قتلِ عام کا منصوبہ بنایا ہے۔ اس بات کو سچا ثابت کرنے کے لئے اجمیر شریف کے عرس سے واپس آنے والے

مسلمانوں کے ایک گروہ کو احمد آباد میں ٹرین سے اتار لیا گیا۔ اور ہندو فرقہ پرستوں نے دعویٰ کیا کہ انہوں نے مسلمانوں کی سازش کو بے نقاب کر کے ناکام بنا دیا ہے۔"

فسادات کے پس پردہ تنظیم اور منصوبہ بندی کے بارے میں دہلی سے شائع ہونے والے انگریزی ہفت روزہ "مین سٹریم" (MAIN STREAM) نے اپنی ۴ر اکتوبر ۱۹۶۹ء کی اشاعت میں لکھا :-

" احمد آباد کے ہنگاموں کے طریقوں سے اس امر کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ اس سے پہلے کے فسادات کا اگر بنظر غائر جائزہ لیا جائے تو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ ایسے طریقے استعمال کئے جاتے تھے کہ کشیدگی بڑھے۔ اقلیتی فرقے کو پہلے وار کرنے پر اکسایا جائے۔ فسادات میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کو ملوث کیا جائے۔ فسادیوں کے نزدیک یہ طریقہ وار کرنے کے ساتھ ساتھ دفاع کا بھی ایک موثر ذریعہ ہے۔ ہجوم جب منتشر ہو جاتا ہے تو فسادی لوگ وسیع علاقے میں چاقو زنی کی وارداتیں کرتے ہیں اور افراتفری میں ان کی یہ حرکت ظاہر نہیں ہونے پاتی۔ انہیں چاقو زنی کی خاص تربیت ملی ہوتی ہے۔ زخموں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وار اس طرح کئے گئے کہ زخم کھا کر مجروح بچنے نہ پائے۔ احمد آباد میں جو کشیدگی پائی جاتی ہے اس کے بڑھنے اور پھیلنے میں دو سال کا عرصہ لگا اور اس عرصے کے دوران پورے صوبہ گجرات میں بے شمار فرقہ وارانہ فسادات ہوئے مسجد الاقصیٰ پر اسرائیلیوں کی دراز دستی کے خلاف احمد آباد کے مسلمانوں نے جب احتجاجی جلوس نکالا تو کشیدگی پھیلنے کا ایک اور بہانہ بنا۔ اس طرح کہ ایک چھوٹا سا واقعہ رونما ہوا اور وہ یہ کہ مسلمانوں کے ایک گروہ اور چند سادھوؤں کے درمیان ایک جھڑپ ہو گئی۔ بس اسی بات کو پورے احمد آباد شہر میں فساد کی آگ لگانے کے لئے کافی بنا لیا گیا۔ شہر کے مہذب علاقے بھی نہیں چھوڑے گئے۔ مسلمانوں کے مکانوں کی پوری کی پوری قطاریں جلا دی گئیں۔ اور چاقو زنی کی بجائے سفاک فرقہ پرستوں نے یہ کیا کہ جلتے ہوئے مکانوں میں سے جو کوئی بھی جان بچانے کی خاطر بھاگ کر باہر آتا تو اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اسے آگ میں دوبارہ ڈال دیا جاتا۔ اسی طرح اکا دکا لوگوں کو چاقو مارنے کی بجائے ایک ہی دفعہ سب کو آگ میں زندہ جلا دینے کا طریقہ اختیار کیا گیا۔"

حکام کا کردار

(۴) ان فسادات سے قبل، ان کے دوران اور ان کے بعد مقامی حکام نے جو کردار ادا کیا، اس کی داستان بہت افسوسناک ہے۔ اس سلسلے میں احمد آباد کے فسادات کی مثال دی جاتی ہے۔ وہاں کے فسادات کے دوران پولیس نے جو کردار ادا کیا، اس کے بارے میں سبھدرا بینرجی نے اپنی رپورٹ میں لکھا :-

" فساد زدہ علاقوں کے دورے کے دوران میں نے سو گز کے فاصلے پر ایک مسجد دیکھی اور وہیں سے ایک تھانہ بھی صاف نظر آ رہا تھا۔ مسجد تباہ ہو چکی تھی۔ پولیس کے رویئے کے بارے میں مجھے مختلف داستانیں سنائی گئیں کہ کس طرح اس نے مسلمانوں کو پناہ دینے والے لوگوں کو مارا پیٹا۔ یہ کوئی نرالی بات نہ تھی۔ کیونکہ پہلے بھی فرقہ وارانہ فسادات میں

پولیس ملوث رہ چکی ہے اور آج بھی مسلح پولیس اور سیکوریٹی فورس کے لوگ بگن ناتھ مندر میں روزانہ آتے جاتے ہیں۔ وہاں بیٹھے ہوئے سادھو انہیں فسادات کی انتہائی مبالغہ آمیز داستانیں سناتے ہیں۔ چنانچہ اُن سے فرض کی ادائیگی اور مسلمانوں کے تحفظ کی توقع ہی فضول ہے۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ مندر کو پولیس اور سیکوریٹی فورس والوں کے لئے خارج از حدود (آؤٹ آف باؤنڈ) قرار دیا جائے۔"

اگر نام نہاد فرقہ وارانہ فسادات کو منظم قتل و غارت گری کہا جائے تو قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انتظامیہ اور بالخصوص پولیس اس دوران کیا کردار سرانجام دیتی ہے۔ مقامی حکام کے رویّے کے بارے میں دہلی سے شائع ہونے والے انگریزی ہفت روزہ لنک (LINK) نے اپنی ۳۱ مارچ ۱۹۶۸ء کی اشاعت میں لکھا۔

"جب فسادات رونما ہوتے ہیں تو انتظامیہ سے متعلق افراد عموماً یہ کرتے ہیں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایک یکساں تعداد کو حالات و واقعات سے منہ موڑ کر گرفتار کر لیتے ہیں تاکہ دونوں فرقے برابر کے شریک سمجھے جائیں۔ کس نے کس پر حملہ کیا، کس نے کس کو قتل کیا یا لوٹا، اس سے انہیں کوئی غرض نہیں ہوتی ـــــ یہی کچھ الہ آباد میں بھی ہوا ـــــ یا"

پارلیمنٹ کے ایک کانگرسی رکن امرت ناتھ نے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کو اپنی رپورٹ میں لکھا:۔

"وہ ہندو جو ہولی کے موقع پر ضلع کے دور دراز علاقوں میں غیر فرقہ وارانہ فسادات کے دوران زخمی ہوئے انہیں بھی اُن مسلمانوں کے ساتھ ہسپتال میں داخل کر دیا گیا جنہیں شہر میں ہونے والے فسادات کے دوران چاقو مار کر زخمی کر دیا گیا تھا۔ ہندو اور مسلمان زخمیوں کو ساتھ ساتھ رکھنے کا مقصد یہ غلط تاثر پیدا کرنا تھا کہ دونوں فرقوں کا نقصان برابر رہا ـــ"

کسی پر مقدمہ نہیں چلایا گیا

(۵) مختلف فرقہ وارانہ فسادات کے حقائق سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے پس منظر میں کوئی ہمہ گیر پلان نہ تھا، اور نہ عام لوگوں کا اُن میں ہاتھ تھا بلکہ یہ چھوٹے چھوٹے مگر منظم گروہوں کی کارستانی تھی لیکن ان کا پتہ لگا کر انہیں بے اثر بنایا جا سکتا تھا۔ انہی حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے ہفت روزہ "لنک" نے اپنی رپورٹ میں لکھا:۔

"لیکن حکام ان گروہوں کا پتہ لگانے میں ناکام رہے۔ آزادی کے بعد بیس برس کے عرصے میں جتنے فسادات ہوئے ان میں قتل و غارت گری کے الزام میں ایک بار بھی کسی شخص کو گرفتار کر کے مقدمہ نہیں چلایا گیا، نہ سزائے موت دی گئی نہ عمر قید سنائی گئی۔"

اس رسالے نے پولیس اور حکام کی جانبداری کی مثالیں دیتے ہوئے آگے چل کر پارلیمنٹ کے کانگرسی ممبر امرت ناتھ کی اس رپورٹ کا ایک حوالہ دیا ہے جو اُس نے الہ آباد کے فسادات کے بارے میں لکھی تھی:۔

"ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے انہیں (پارلیمنٹ کے ممبروں کو) بتایا کہ ہلاک ہونے والے تین افراد میں سے دو مسلمان تھے۔ لیکن جب ممبروں نے مرنے والے غیر مسلم کا نام دریافت کیا تو اس موقع پر جتنے بھی پولیس افسر موجود تھے، سب ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے اور سرگوشیاں شروع کر دیں۔ بالآخر ہمیں بتایا کہ وہ نام سے ناواقف ہیں۔ صاف ظاہر تھا کہ ہندو کی موت کی کہانی من گھڑت تھی۔"

اعداد و شمار

(۶) ۱۹۵۲ء سے لے کر ۱۹۶۰ء تک فسادات کی تعداد بتدریج کم ہوتی رہی۔ لیکن بعد کے برسوں میں یہ آگ پھر بھڑکنے لگی۔ مرنے والوں کی تعداد، تباہ ہونے والی جائیدادوں کی مالیت اور جن طریقوں سے مسلمانوں کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا گیا، اگر ان سب باتوں کا ایک سرسری جائزہ لیا جائے تو یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ تشدد کے واقعات کی نہ صرف شدت بلکہ پھیلاؤ میں بھی بہت اضافہ ہوا۔ صرف ۱۹۶۵ء میں جبکہ بھارت اور پاکستان کی جنگ ہوئی مسلم کش فسادات میں خاص کمی پیدا ہوئی۔ اس کی وجوہات اور تھیں۔ ۱۹۶۴ء میں فسادات اپنی انتہا کو پہنچ گئے تھے۔ اس سال تشدد کے ایک ہزار ایک سو ستر واقعات ہوئے۔ ۱۹۶۵ء میں یہ تعداد کم ہو کر چھ سو چھہتر رہ گئی۔ ۱۹۶۶ء میں اگرچہ فسادات کے واقعات کی تعداد ایک سو چوالیس تھی لیکن اپنی ہلاکت خیزی اور شدت کے اعتبار سے یہ واقعات بہت بڑے تھے۔ ۱۹۶۷ء میں گڑبڑ کے دو سو بیس واقعات ہوئے اور ان میں کشت و خون کے جہاں اور واقعات شامل ہیں وہیں رانچی کا وہ فساد بھی ہے جس کی خون آشامی نے ساری دنیا کو چونکا دیا تھا۔ ۱۹۶۸ء میں مار دھاڑ کے تین سو چھیالیس واقعات ہوئے۔ میرٹھ، رانی گنج، اندور، کلکتہ، الٰہ آباد، اور جبل پور میں ہونے والی قتل و غارت گری اسی سال کے دوران ہوئی۔ یہ سلسلہ جب ۱۹۶۹ء تک پہنچا تو اس کے واقعات کی صحیح تعداد معلوم نہ ہو سکی۔ تاہم اس کے نو ماہ میں دو سو دس بار مسلمانوں کی خونریزی ہوئی۔ احمد آباد کی وہ خونریزی بھی اس میں شامل ہے جس میں بلا مبالغہ ہزارہا مسلمان ذبح کئے گئے۔

یہ تو تھی واقعات کی گنتی اور شماریات۔ اب ذرا یہ بھی دیکھ لیجئے کہ کتنے بے گناہ انسان ان واقعات کی بھینٹ چڑھے۔ ۱۹۵۴ء سے ۱۹۶۲ء تک نو سال کے عرصے میں انتہا پرستوں نے تین سو سولہ بے خطا انسانوں کی جان لی۔ صرف ۱۹۶۴ء میں تقریباً تین سو افراد فرقہ وارانہ فسادات کی نذر ہو گئے۔ ۱۹۶۸ء بھی اپنی خون آشامی کے لئے کچھ کم نہ تھا۔ اس کے پہلے چھ ماہ کے دوران ہی تقریباً تین سو بے گناہوں کا خون انتہا پرستوں کے تعصب کی بھینٹ چڑھا۔ اگلے چھ ماہ کی داستان تو اور بھی دردانگیز اور خون سے رنگین ہے۔

(۷) مولانا کے مقالہ میں اس قسم کے فسادات کی ابھی بہت سی تفاصیل باقی ہیں جن کے درج کرنے کی یہاں گنجائش نہیں۔ لیکن احمد آباد کے فساد کی تفصیل اس قدر دردانگیز اور حیا سوز ہے کہ اسے سامنے لائے بغیر ہم آگے نہیں بڑھ سکتے۔ اس میں لکھا ہے کہ

احمد آباد کا فساد

"ہندوستان ٹائمز" کے نامہ نگار اجیت بھٹاچارجی کی ایک رپورٹ ۵ اکتوبر ۱۹۶۹ء کو شائع ہوئی۔ اس میں اس نے لکھا:۔

شہر کی کچھ بستیاں اس طرح ہموار ہو گئیں کہ جیسے بیک وقت آگ اور طوفان کی لپیٹ میں آ گئی ہوں۔ عیدگاہ کی بستی میں ایک لمبے چوڑے نکونے علاقے میں جو کچھ بچا وہ یہ تھا۔ ایک دیوار کا کچھ حصہ سیاہ اور مڑی تڑی لوہے کی چادریں، کچھ کانٹھ کباڑ اور راکھ کے ڈھیر۔ ایک جگہ بجھتے ہوئے چنوں کا ڈھیر لگا تھا اور اس میں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ قریب کے چند دکانداروں نے مجھے بتایا کہ وہاں چنے کی دکان تھی جو ایک مسلمان کی ملکیت تھی۔ کچھ شرپسندوں نے اُسے آگ لگا دی اور جلد ہی شعلے لکڑی کے گوداموں تک پھیل گئے جو ہندوؤں کے تھے۔ اس وقت فساد عروج پر تھا۔ چنانچہ آگ بجھانے کی اپیل پر نہ تو پولیس نے کان دھرے اور نہ ہی فائر بریگیڈ نے کوئی عملی قدم اٹھایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پورا بلاک جل کر ختم ہو گیا۔

درمیانے درجے کے مکانوں کی ہر قطار جل کر تباہ ہو گئی۔ ہر مکان کے دروازے اور کھڑکیاں جل گئی تھیں۔ بجلی کی اشیاء اکھیڑ لی گئی تھیں۔ ہر گھر کا فرنیچر اور سامان یا تو توڑ دیا گیا تھا یا جلا دیا گیا تھا۔ سڑک پر جلی ہوئی چیزوں کے ڈھیر میں ایک جلے ہوئے رکشا کا ڈھانچہ صاف پہچانا جا رہا تھا۔ میرے ساتھ ایک رہبر تھا۔ اس نے فساد کے دوران بہت سے مسلمانوں کو پناہ دی تھی۔ اس نے ڈھیر کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ وہاں شرپسندوں کے ہجوم نے ایک مسلمان کو زندہ جلا دیا تھا۔ پھر اس نے اپنے کاندھے پر مجھے ایک نیلا نشان دکھایا جو لاٹھی کی ضرب لگنے سے پڑ گیا تھا۔ یہ چوٹ ایک مسلمان بچی کو فسادیوں کے ہاتھوں بچانے کا صلہ تھا۔

فساد کے دوران کس قدر جانیں ہلاک ہوئیں، اس کے بارے میں اجیت بھٹاچارجی کا خیال ہے کہ اصل تعداد کا پتہ چل ہی نہیں سکتا۔ وجہ یہ کہ جن لوگوں پر ظلم کے پہاڑ ٹوٹے، ان میں سے اکثر تو مر گئے اور کچھ لوگ بھاگ گئے بہت سی لاشیں موقع ہی پر جلا دی گئیں۔ ایک اور بڑا مسئلہ جو صوبائی حکومت کو درپیش ہے وہ یہ ہے کہ جن مسلمان دکانوں کے کمانے والے فساد کی آگ کی نذر ہو چکے ہیں انہیں اگر امداد مہیا کی جائے تو مرنے والوں کی تعداد اس طرح خود بخود متعین ہو جائے گی جبکہ حکومت کسی لاش یا کسی اور قسم کے ٹھوس ثبوت کے بغیر ایسا نہیں چاہتی۔

تاہم مقامی حکام نے یہ تسلیم کیا کہ ڈیڑھ سو کے لگ بھگ افراد فساد کے دوران جان بحق ہوئے۔ بعد میں جب مرکزی حکومت کے وزیر داخلہ مسٹر چاون نے شہر کے فساد زدہ علاقوں کا دورہ کیا تو انہوں نے اندازہ لگایا کہ مرنے والوں کی تعداد ساڑھے تین سو سے لے کر چار سو تک ہو گی۔ لیکن اخبارات نے اس سے بھی بڑی تعداد کی خبریں شائع کیں۔ برطانیہ کے کچھ اخبارات نے لکھا کہ احمد آباد میں ایک ہزار افراد ہلاک ہوئے۔ اس پر بھارتی اخبارات یہ تعداد ہزاروں میں بتانے لگے۔ حتیٰ کہ بھارت کے بائیں بازو کے ایک کثیر الاشاعت ہفت روزہ "بلٹز" نے اس رپورٹ کے کچھ

حصے شائع کر دیتے جو بھارت کی قومی اتحاد کونسل کے ممبر پروفیسر سنتیمائے رائے نے وزیراعظم اندرا گاندھی کو ارسال کی تھی۔

اخبار مذکور نے پروفیسر رائے کے حوالے سے لکھا ہے کہ انہوں نے ایک محتاط اندازے کے مطابق مرنیوالوں کی تعداد چار ہزار لکھی ہے۔ ۱۳۔ دسمبر ۱۹۶۹ء کی اشاعت میں ہفت روزہ "بلٹز" نے لکھا:

"وہ پروفیسر رائے کا کہنا ہے کہ صرف ہسپتالوں کی رپورٹوں ہی کے مطابق ۱۲ سے ۱۸ ستمبر تک، دو ہزار اڑتالیس لاشیں سول ہسپتال لائی گئیں۔ اس تاریخ کے بعد لاشوں کو ڈھنڈیشوار کے قبرستان میں لے جایا گیا۔ وہاں انہیں بڑے بڑے گڑھوں میں ڈال کر مٹی سے ڈھانپ دیا گیا۔ جائدادوں کے نقصان کے بارے میں مختلف اداروں کے اندازے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ گجراتی جریدے نے اس نقصان کا اندازہ بتیس کروڑ کا لگایا ہے لیکن پروفیسر رائے کے مطابق اصل نقصان پچاس کروڑ روپے سے بھی اوپر ہوا۔"

احمد آباد میں مسلمان مردوں اور عورتوں پر جو ہولناک ظلم و تعدی ہوا، پروفیسر سنتیمائے رائے اس کے چند نمونے قلم بند کرنے میں کامیاب ہوئے۔ انہیں پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انسان کس قدر وحشی اور ذلیل ہو سکتا ہے۔ پروفیسر کی رپورٹ کے چند اقتباسات درج ذیل ہیں۔

ایک زخمی عورت نے جسے ہسپتال میں داخل کیا گیا، بیان دیا کہ جمعہ کی رات قتل و غارت گری کی رات تھی۔ نو بجے سے بلوائیوں نے کئی کئی سو کے جتھوں میں اکٹھے ہو کر حملے شروع کر دیئے۔ وہ سب کے سب مسلح تھے۔ فسادیوں نے سب سے پہلے ہمیں ہمارے گھروں سے باہر گھسیٹا۔ اس کے بعد ہمارے گھر کی تمام اشیاء کو جلا دیا گیا۔ ہمارے مردوں اور بچوں کی لاشوں کے ٹکڑے کئے گئے اور انہیں آگ میں ڈال دیا گیا۔ بلوائی شراب کے نشے میں تھے۔ انہوں نے ہم پر مجرمانہ حملے کئے۔ کئی عورتوں کو قتل کر دیا۔ کچھ عورتوں کی تلواروں سے چھاتیاں کاٹ دیں۔ پھر وہ ہمیں بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے وہاں سے لے گئے۔ ہم سب کو ننگا کر دیا۔ کچھ غنڈوں نے ہماری شرمگاہوں پر تیز دھار تلواریں چلائیں۔ ہم روئیں، چیخیں، اور ان غنڈوں سے رحم کی بھیک مانگی اور کہا کہ ہمیں مار دو، ٹکڑے کر دو، لیکن ہمیں بے عزت نہ کرو۔ لیکن ان پر کچھ اثر نہ ہوا۔ وہ ہمیں ایک خالی مکان میں لے گئے اور وہاں ہم پر مجرمانہ حملے کئے۔ اس کے بعد جب مجھے ہوش آیا تو خود کو ہسپتال (سول ہسپتال احمد آباد) میں پایا۔ یہاں مجھے یہ دھمکی دی گئی کہ اگر میں نے کسی کو کچھ بتانے کی کوشش کی تو مجھے ہسپتال سے نکال دیا جائے گا۔

ایک اور عورت نے بھی اسی قسم کا بیان دیا۔ اس کی داستان یوں ہے۔ ہمارے کچھ مرد تو بلوائیوں سے لڑتے ہوئے مارے گئے اور کچھ بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔ تقریباً تین یا چار سو کے ایک گروہ نے مجھے پکڑ لیا۔ انہوں نے مجھے گھر سے باہر گھسیٹ کر ننگا کر دیا اور مجھ پر مجرمانہ حملے کئے۔ صبح سے پہلے ان میں سے کسی نے میری چھاتیاں کاٹ دیں

اور میرے ہاتھ پیر باندھ کر لٹا دیا۔ اس کے بعد میرے گال کاٹ دیئے۔ پھر ایک آدمی نے میری پیشاب گاہ پر ایسڈ ڈال دی۔ میں روتی، چیخی، حتیٰ کہ میں بے ہوش ہو گئی۔ اور جب آنکھ کھلی تو میں سول ہسپتال میں تھی۔"

بھوانڈی میں

(۸) بھوانڈی میں، بستی کو فساد شروع ہوتے اور پھر یہ آگ دوسرے شہروں کینبری، کولابہ، عباد، ساتراں، جلگاؤں، کولیاں، دیپاوالی، دہلی اور تھانہ تک پھیلتی چلی گئی۔ یہ تمام شہر بھوانڈی سے دو سو چالیس میل سے لے کر چار سو میل دور تک واقع ہیں۔ لیکن ان سب مقامات پر فسادات کا بیک وقت شروع ہونا یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ ایک سوچی سمجھی سکیم تھی اور اکثریتی فرقے کے لوگوں کا "ذہنی ابال" نہ تھا۔

بجلی کاٹ کر سارے شہر میں اندھیرا کر دینے کے بعد بھالوں، مالوٹوف، کاک ٹیل، پٹرول، آگ کے گولوں اور تیروں کا استعمال بھی یہ ثابت کرتا ہے کہ ظلم کے ہاتھ کس قدر منظم اور ان کی جنبش کتنی ہم آہنگ تھی اور نمایاں بات یہ ہے کہ یہ خونیں ڈرامے کرفیو کے اوقات کے دوران ہوئے جبکہ پولیس اور فوج کے دستے بھی گشت پر ہوتے ہیں۔

کچھ سرکاری اور نیم سرکاری اعداد و شمار کے مطابق جو اگرچہ درست نہیں ہوتے، اموات کی علاقہ وار تفصیل یہ ہے: بھوانڈی میں ترلیسٹھ، جلگاؤں میں بیالیس، اور تھانہ میں چار۔ ۱۲ مئی تک زخمی ہونے والوں کا سرکاری تخمینہ تین سو انتیس کا ہے۔

یونائیٹڈ نیوز آف انڈیا کے مطابق دو کروڑ روپے کی جائیداد تباہ ہوئی۔ تقریباً دو سو کرگھے، پچاس دکانیں اور نئے ہی مکان، ان کے علاوہ کئی کارخانے جلا کر راکھ کر دیئے گئے۔ بنارس کی ریشمی ساڑھیاں تیار کرنے کا ایک مرکز بھی تباہ ہو گیا۔

نئی دہلی سے شائع ہونے والے جریدے "مین سٹریم" نے متاثرہ علاقوں کے سروے کے بعد ایک رپورٹ شائع کی جس میں یہ انکشاف ہوا کہ شہر کی ایک لاکھ چالیس ہزار کی آبادی میں سے تقریباً چالیس ہزار بے گھر ہوئے۔ چالیس ہزار برقی کھڈیوں میں سے آٹھ ہزار جلا دی گئیں جس سے کوئی دس ہزار افراد بے روزگار ہو گئے۔ تقریباً سوا سو افراد مارے گئے اور دو ہزار کے قریب زخمی ہوئے۔

ایک المناک واقعہ یہ ہوا کہ جوشی پورہ میں شرپسندوں نے تیئیں افراد پر مشتمل ایک برات کو مکان میں مقفل کر دیا اور اس کے بعد آگ لگا دی، سب کے سب جل کر بھسم ہو گئے۔

بھارت کی سپریم کورٹ کے ایک سینئر ایڈووکیٹ ایس۔ پی سنہا نے ملک میں اقلیتوں پر ہونے والے ظلم و تشدد کے بارے میں ایک مضمون لکھا جو "ریڈینس" کی ۲ جون ۷۰ء کی اشاعت میں شائع ہوا۔ اس میں ایس۔ پی سنہا نے لکھا:

"رانچی، جمشید پور، اندور، مئو، الہ آباد، میرٹھ، احمد آباد، بھیونڈی، جلگاؤں ——— اس فہرست کی طوالت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ ان شہروں میں جو کچھ ہوا اس نے تمام سابقہ ریکارڈ مات کر دیئے۔ جان و مال کا نقصان بے اندازہ ہوا۔

پرانا طریقہ

فسادی لوگ فساد برپا کرنے کے لئے ایک ہی طریقہ استعمال کرتے ہیں۔ جن سنگھ کا کرایہ کا آدمی ہندوؤں کے کسی جلوس پر کوئی چیز پھینک دیتا ہے اور اس کے فوراً بعد پہلے سے سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق مسلمانوں پر حملہ کر دیا جاتا ہے۔ حملے کے دوران نہ بچوں کو معاف کیا جاتا ہے، نہ بوڑھوں کو اور نہ کمزوروں کو۔

اگر فساد کی ابتدا کرنے کے لئے کرایہ کا کوئی ایجنٹ نہ ملے تو پھر بہانہ یہ بنا لیا جاتا ہے کہ مسلمانوں نے مندر پر حملہ کیا تھا۔ احمد آباد میں ایک مسجد کو اس بہانے سے تباہ کر دیا گیا کہ مسلمانوں نے جگن ناتھ مندر پر مبینہ طور پر حملہ کیا۔ حالانکہ وہ حملہ نہ تھا بلکہ یہ چند جوانوں کی شرارت تھی جسے رائی کا پہاڑ بنا کر حملہ قرار دے دیا گیا۔ اس "حملے" کے دوران مندر کے دروازے کے صرف شیشے ٹوٹے لیکن بعد میں مسلمانوں کو اس کی بھاری قیمت چکانی پڑی۔ بے شمار جانیں ہلاک ہوئیں اور ان کی جائیدادیں راکھ کا ڈھیر بنا دی گئیں۔"

یہ ہے مختصر سا جائزہ اس "سلوک" کا جو ہندوؤں کی طرف سے خود ان کی مملکت میں رہنے والے مسلمانوں کے خلاف روا رکھا جا رہا ہے۔ ان مسلمانوں کے خلاف جو وہاں کی مملکت کے باشندے اور انڈین نیشنلز ہیں۔ اس سلسلہ میں ہم صرف ایک سوال پوچھنا چاہتے ہیں اور وہ یہ کہ کیا اس قسم کے مسلسل واقعات کی مثال دنیا کی کسی اور قوم کی تاریخ میں بھی ملتی ہے؟ اور قتل و غارت گری اور وحشت و بربریت کا یہ سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا جس وقت یہ سطور (اپریل ۱۹۷۱ء میں) قلمبند کی جا رہی ہیں، برہان پور کے تازہ ترین فسادات کی دل دوز اطلاعات موصول ہو رہی ہیں۔

نراد چودھری کا تبصرہ

ایک بنگالی نژاد ہندو ہے ——— NIRAD C. CHAUDHURI ——— کہ رسیدہ اور بڑا فاضل۔ اس نے ہندو ذہنیت کا مطالعہ ایسی گہرائی سے کیا ہے کہ بایدو شاید۔ اور اسے پھر اپنی شہرۂ آفاق کتاب (THE CONTINENT OF CIRCE) میں بڑی خوبصورتی سے بے نقاب کیا ہے۔ وہ اس میں ہندو مسلم فسادات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ

ہندوستان میں ہندو مسلم تعلقات کے سلسلہ میں جو اصل حقیقت ہے اور اسے جس انداز سے پیش کیا جاتا ہے، اس سے بڑا تضاد میں نے ساری عمر کہیں اور نہیں دیکھا۔ میں نے ہندو مسلم فسادات کے ضمن میں قتل و غارت گری، لوٹ، عصمت ریزی کے واقعات نہایت وسیع پیمانے پر دیکھے

بھی ہیں اور ان کی روئداد بھی پڑھی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میں نے یہ بیانات بھی اپنی آنکھوں سے پڑھے ہیں کہ ایسے واقعات کے لئے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کیونکہ ہندو اور مسلمان تو نسلی اور ثقافتی اعتبار سے ایک ہیں (اور جو ایک ہوں ان میں عداوت اور تنافر کیسے ہو سکتا ہے) (صفحہ ۳۹)

آگے چل کر وہ لکھتا ہے کہ مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کے جذبات نفرت و عداوت کو چھوڑیئے، اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کا ادنیٰ ذات کے ہندوؤں کے ساتھ جو برتاؤ ہے اس کا اندازہ رامائن کی اس حکایت سے لگایئے جس میں کہا گیا ہے کہ

> ایک دن رام کو بتایا گیا کہ فلاں جگہ ایک برہمن کا اچانک انتقال ہو گیا ہے اور اس قسم کے ناشدنی واقعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ملک میں کہیں مہا پاپ (بہت بڑا گناہ کا کام) ہوا ہے۔ شری رامچندر جی مہاراج معاملہ کی تحقیق کے لئے نکلے تو انہوں نے دیکھا کہ ایک شودر، ایشور کی بھگتی اس طریق سے کر رہا ہے جو اعلیٰ ذات کے آریوں کے لئے مختص ہے۔ اس پر اس شودر کا سر قلم کر دیا گیا۔ اور جونہی اس کا سر بدن سے جدا ہوا، وہ برہمن زندہ ہو گیا۔ اس پر دیوتاؤں نے رامچندر پر تبریک و تحسین کے پھول برسائے کہ انہوں نے اس ضرب کاری سے آریائی ثقافت کی حفاظت کا سامان بہم پہنچایا ہے۔ (صفحہ ۱۲۷)

یہ ہے ہندو، اور یہ ہے اس کا جذبۂ منافرت!

اور یہی ہندو، اب مشرقی بنگال کے مسلمانوں کے خلاف مظالم کی فرضی داستانیں وضع کر کے، ان کے غم میں گھلا جا رہا ہے، اور ان کی "مرہم پٹی" کے لئے فوجوں کی فوجیں اور گولہ بارود سے لدی ہوئی گاڑیاں بھیج رہا ہے۔ اور دنیا سے چلا چلا کر کہہ رہا ہے کہ میں یہ سب کچھ انسانیت کے دکھوں کے مداوا کے لئے کر رہا ہوں۔

یہ ہے وہ قوم جس کے ساتھ ہمیں واسطہ پڑا ہے۔

(۰)

پاکستان کو ختم کرنے کی سازش

ہم دیکھ چکے ہیں کہ ہندوؤں نے تقسیم ہند کا اصول تسلیم کرنے کے ساتھ ہی اعلان کر دیا تھا کہ ہم کسی نہ کسی طریق سے پاکستان کے جداگانہ وجود کو ختم کر کے اسے پھر سے ہندوستان کا حصہ بنا لیں گے۔ اس سلسلہ میں کیا کیا گیا، اسے بھی غور سے سنیئے:-

تقسیم کے معاہدہ کی رُو سے، ایک لاکھ پینسٹھ ہزار ٹن فوجی سامان پاکستان کے حصہ میں آیا تھا۔ اس میں سے

ترکہ کی تقسیم

ہندوستان نے (۳۱ مارچ ۱۹۴۸ء تک) صرف (۴۷۰۳) ٹن سامان پاکستان کو دیا۔ باقی سب خود ہڑپ کر گیا۔ تقسیم کے وقت چار ارب روپیہ نقد ہندوستان میں موجود تھا جس میں سے ایک ارب روپیہ پاکستان کے حصے میں آتا تھا۔ ہندوستان نے اس رقم کے دینے سے بھی انکار کر دیا اور دسمبر ۱۹۴۷ء میں بمشکل اس پر رضامند ہوا کہ پاکستان کو (۷۵) کروڑ روپیہ دیا جائے۔ اس میں سے بیس کروڑ روپیہ پاکستان کو پہلے مل چکا تھا۔ ہندوستان بقایا ۵۵ کروڑ دبا کر بیٹھ گیا۔ اس کے لئے پاکستان کو ہزار جتن کرنے پڑے اور جب بین الاقوامی دباؤ کے ماتحت ہندوستان کو یہ روپیہ ادا کرنا پڑا تو اس میں سے بھی پانچ کروڑ روپیہ ڈنڈی مار کر رکھ لیا جو آج تک نہیں دیا۔ (جس زمانے میں ہندوستان، پاکستان کے حصہ کا روپیہ دبا کر بیٹھا ہوا تھا، ہندوستان کے حصہ کے نوّے جنگی ہوائی جہاز پاکستان میں پڑے تھے۔ پاکستان نے نوّے کے نوّے بحفاظت ان کے حوالے کر دیئے۔

لیکن کمینہ فطرت ہندو کی آتشِ انتقام اس سے فرو تھوڑے ہو سکتی تھی۔ وہ تو پاکستان کو سرے سے ختم کر دینے کی فکر میں تھا۔ تقسیم کے بعد، پاکستان جس حالت میں تھا، اور ہندوستان اسے کمزور سے کمزور تر کرنے کے

جنگ کی تیاریاں

لئے جو کچھ کر رہا تھا، اسے پیشِ نظر رکھئے، اور اس کے بعد ڈھاکہ کے سابق چیف جسٹس مسٹر شہاب الدین کا یہ انکشاف ملاحظہ فرمائیے کہ ہندوستان نے دسمبر ۱۹۴۷ء میں فیصلہ کر لیا تھا کہ پاکستان پر حملہ کر دیا جائے، لیکن بعض داخلی مصالح کے پیشِ نظر اس فیصلہ پر عملدرآمد نہ ہو سکا۔ جب ۱۹۵۰ء میں بنگال میں فسادات کرائے گئے تو اس کے ساتھ ہی وہاں پاکستان پر فوجی حملہ کرنے کی ایک تحریک چلائی گئی جس کی تائید وہاں کے بڑے بڑے لیڈروں ـــــ مثل پنڈت نہرو، جے پرکاش نرائن، آر کے چودہری وغیرہ سب نے کی۔ وزیراعظم پاکستان ـــ نوابزادہ لیاقت علی خان (مرحوم) نے صلح کا ہاتھ بڑھایا۔ لیکن پنڈت نہرو نے اس پیشکش کو نہایت بے اعتنائی سے ٹھکرا دیا۔ ابتدائے ۱۹۶۵ء میں ہندوستان نے "رن آف کچھ" میں چھیڑ چھاڑ شروع کر دی تو وہاں کے ہوم منسٹر نندا نے لوک سبھا میں اعلان کیا کہ ہم نے پوری آٹھ لاکھ فوج کو تیاری کا حکم دے دیا ہے۔ اور وزیراعظم نے یہ کہہ کر اس کی تائید کی کہ آج ہندوستان کی پینتالیس کروڑ آبادی ہر قربانی کے لئے تیار کھڑی ہے۔ اِدھر رن آف کچھ کے علاقے میں یہ ہو رہا تھا، اور اُدھر بنگال میں انہوں نے پاکستانی علاقہ، دابا گرام پر دھاندلی سے قبضہ کر لیا ـــــ اور پھر ستمبر ۱۹۶۵ء میں جو کچھ ہوا، اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ واقعہ تو ہماری موجودہ نسل کی آنکھوں کے سامنے ظہور میں آیا تھا۔

میں نے عزیزانِ من! اس سلسلہ میں مسئلہ کشمیر کا ذکر قصداً نہیں چھیڑا کیونکہ وہ ہندو ذہنیت کی فی ذاتہٖ مکمل

---

[1] نہ ہی ہم نے حیدرآباد، جوناگڑھ وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔

تصور ہے اور اس کی تفصیل میں جانے کے لئے کافی وقت چاہیئے۔ لیکن میں اس ضمن میں، کم از کم ایک مثال ضرور پیش کرونگا جس سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ہندو کس قدر کینہ فطرت واقع ہوا ہے۔ کوئی دو سال ادھر کا ذکر ہے (یعنی ۱۹۶۸ء کا) کہ جمعیت العلماء ہند کے ناظم عمومی' (اور مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) کے صاحبزادہ) مولانا سید اسعد مدنی نے اپنا ایک خط اخبارات میں شائع کیا تھا جو انہوں نے کسی وقت لال بہادر شاستری کو لکھا تھا۔ اس خط میں انہوں نے شاستری صاحب سے کہا تھا۔

> میں نے اخبارات میں شائع شدہ آپ کی ایک تقریر پڑھی جس میں آپ نے این۔ سی۔ سی کے ایک اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ پاکستان جو ہمیشہ اسلام کی اصطلاح میں سوچتا ہے اس دھوکے میں ہے کہ وہ کشمیر کو اس لئے ہڑپ کرلے گا کہ وہ مسلم اکثریت کا علاقہ ہے۔ یہ پاکستان کی خام خیالی ہے۔ ہندوستان میں پانچ کروڑ مسلمان بستے ہیں۔ اگر پاکستان یہ سوچتا ہے کہ وہ مسلم اکثریت کے بل پر کشمیر کو لے سکتا ہے تو اسے اچھی طرح سوچ رکھنا چاہیئے کہ اس صورت میں ہندوستان کے پانچ کروڑ مسلمانوں کا کیا حشر ہو گا۔

(ماہنامہ "تذکرہ" دیوبند۔ بابت دسمبر ۱۹۶۸ء بحوالہ طلوع اسلام جون ۱۹۶۹ء)

آپ سوچئے کہ کیا دنیا میں کمینگی اور بدفطرتی کی اس سے بدتر مثال کوئی اور بھی ہو سکتی ہے؟ یعنی اگر پاکستان نے کشمیر کے مسئلہ کو اٹھایا تو ہندو، ہندوستان کے پانچ کروڑ مسلمانوں کو ختم کر دے گا! یا للعجب!

———— (۰) ————

جنگ کے بعد

۱۹۶۵ء کی جنگ میں استخوان شکن شکست کھانے کے بعد، ہندو نے اپنا پینترا بدلا' اور جو مقصد کھلے میدان میں جنگ کے ذریعے حاصل نہیں ہو سکتا تھا' اُسے زمین دوز سازش کے ذریعے حاصل کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ جنوری ۱۹۶۶ء میں' معاہدہ تاشقند پر دستخط ہوئے تو مارچ ۱۹۶۶ء میں شیخ مجیب الرحمٰن نے اپنے "چھ نکات" پیش کر دیئے۔ ان نکات کے سلسلہ میں جو قرائن و شواہد دستاویزی ثبوت کے ساتھ سامنے آئے ہیں' ان کا تذکرہ طلوع اسلام کی سابقہ (اپریل کی) اشاعت کے لمعات میں کیا جا چکا ہے۔ مجیب صاحب کی' اگر تلہ سازش کیس کے سلسلہ میں ۱۹۶۷ء میں گرفتاری عمل میں آئی اور ۱۹۶۹ء میں اس مقدمہ کو غتر بود کرا کر انہیں چھڑا لیا گیا۔ ۱۹۷۰ء کا پورا سال انتخابی مہم کے پردے میں' اس سازش کی آخری تیاریوں میں گزرا' اور اس کے بعد جو کچھ پردے سے باہر آیا وہ سب کے سامنے ہے۔ اس مرتبہ وہ لوگ پاکستان کو عملاً ختم کر چکے تھے۔ لیکن خدا کا شکر ہے' ہزار بار شکر ہے کہ جن قابلِ صد فخر جیوش و عساکرِ پاکستان نے ۱۹۶۵ء میں' ہندو عزائم کو خاک میں ملا کر رکھ دیا تھا' انہی نے اب پھر ان کی اس سازش

کو بھی بوڑھی گنگا میں ڈبو دیا ہے۔ خدا کرے کہ وہ اب اسے جڑ بنیاد سے اکھیڑ ڈالنے میں کامیاب ہو جائیں۔

(۷)

یہ ہے ہماری قوم کے نونہالو! ہندو دیوتا کے روپ کی ایک جھلک۔ اب آپ خود ہی اندازہ لگا لیں، کہ

یہ ہے ہندو

ہمیں کس قسم کے ہمسایہ سے واسطہ پڑا ہے۔ اور اس کے بعد آپ سوچئے کہ کیا ہم ایک سیکنڈ کے لئے بھی اپنے دل میں خیال کر سکتے ہیں کہ اس ہمسایہ کے ہاتھوں ہمارا کچھ بھی محفوظ ہے؟ اگر کوئی شخص ایسا خیال کرتا ہے تو وہ فریبِ نفس کا شکار ہے۔ مسلمان کے خلاف ہندو کی دشمنی ازلی ہے اور یہ ابد تک اسی طرح رہے گی۔ اگر آپ کو اس کا مزید ثبوت درکار ہو تو آپ (اُس زمانے کے ہندوستان کے) وزیرِ دفاع مسٹر چوہان کا وہ بیان پڑھیئے جو اس نے، ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ میں شکست کھانے کے بعد دیا تھا۔ اس بیان میں اُس نے کہا تھا کہ

> پاکستان اور ہندوستان کے درمیان اسی دن سے مخاصمت کی بنیاد رکھ دی گئی تھی جس دن پاکستان معرضِ وجود میں آیا تھا۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان آئیڈیالوجی کا اختلاف ہے۔ اس کے سوا کوئی اختلاف نہیں۔ اور یہ اختلاف اور دشمنی مہینے یا ہفتہ بھر کی نہیں، بلکہ سالہا سال تک رہے گی بھارت کو اس کے لئے ایک تازہ اور فیصلہ کن جنگ کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔
>
> (طلوعِ اسلام۔ فروری ۱۹۶۶ء)

مسٹر چوہان نے یہ بیان اس وقت دیا تھا جب وہاں کے وزیرِ اعظم، معاہدہ تاشقند پر دستخط ثبت فرما رہے تھے ایسے کھلے ہوئے دشمن سے اپنے آپ کو ایک لمحہ کے لئے بھی محفوظ سمجھنا انتہائی خود فریبی ہے۔ اس خطرہ سے محفوظ رہنے کے لئے قوم کو ہر وقت تیار رہنے کی ضرورت ہے کہ

جہاں بازو سمٹتے ہیں، وہیں صیاد ہوتا ہے

یہی ہے وہ دشمن جس کے متعلق قرآن کریم نے ہم سے تاکیداً کہا تھا کہ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بِطَانَةً مِّن دُونِكُمْ لَا يَأْلُونَكُمْ خَبَالًا اے جماعتِ مومنین! دیکھنا۔ اپنوں کے سوا کسی کو اپنا ہمراز و دمساز نہ بنانا۔ وہ تمہاری تخریب میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے۔ وَدُّوا مَا عَنِتُّمْ جس بات سے تمہیں نقصان پہنچے اس سے وہ بہت خوش ہوتے ہیں۔ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِي صُدُورُهُمْ أَكْبَرُ تمہارے خلاف جو کچھ وہ سوچتے رہتے ہیں اس میں سے یونہی کوئی بات اُن کے منہ سے نکل جاتی ہے تو تمہیں کچھ اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان کے عزائم کیا ہیں۔ لیکن جو کچھ ان کے سینے میں مخفی ہوتا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ (۳/۱۱۸)

اس کا علاج کیا ہے؟

اب سوال یہ ہے کہ اس قسم کے دشمن سے محفوظ رہنے کے لئے کیا کیا جائے۔ سو اس کے لئے ایک تو قرآن نے یہ تدبیر بتائی ہے کہ وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ۔ (۸/۶۰) اپنی سرحدوں کو فوجی چھاؤنیوں سے مستحکم رکھو۔ لیکن یہ اس تدبیر کا صرف خارجی پہلو ہے۔ اس خطرہ سے مصئونیت کا حقیقی علاج اور ہے جسے قرآن نے ان چار لفظوں میں بیان کر دیا ہے کہ وَ اِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا۔ (۳/۱۲۰) اگر تم ثابت قدم رہے اور اپنا نظامِ معاشرہ قوانینِ خداوندی کے مطابق متشکل کر لیا تو ان کی خفیہ تدبیریں اور سازشیں تمہارا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکیں گی۔

بس یہ ہے اس خطرہ سے محفوظ رہنے کا صحیح، قابلِ اعتماد اور یقینی علاج۔ یعنی نظامِ معاشرہ کی قوانینِ خداوندی کے مطابق تشکیل۔ یہی وہ نظام ہے جس میں کوئی فرد اپنی بنیادی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہیں رہتا۔ جس میں کوئی کسی کی محنت کو غصب نہیں کر سکتا۔ جس میں ہر شخص کو بلا دقت و بلا مشقت انصاف ملتا ہے۔ جس میں ہر انسانی بچہ، محض انسان ہونے کی جہت سے، یکساں عزت کا مستحق قرار پاتا ہے۔ جس میں عورت اور مرد، دونوں یکساں حقوق کے مالک ہوتے ہیں۔ جس میں کوئی انسان، اپنے آپ کو، سوائے قوانینِ خداوندی کی اطاعت کے، کسی کا محکوم و محتاج نہیں پاتا۔ یہی ہے وہ نظام جس میں قومیت کا مدار، دین کے اشتراک پر ہوتا ہے۔ جس میں کوئی غیر مسلم، مسلمان قوم کا فرد قرار نہیں پا سکتا اور مسلمانوں میں رنگ، نسل، زبان، جغرافیائی حدود کے امتیازات کی بنا پر کسی قسم کی تفریق نہیں ہوتی۔ وہ سب ملّتِ اسلامیہ کے ایسے افراد ہوتے ہیں جو دل کے پورے سکون اور ذہن کے کامل اطمینان کے ساتھ، ہر خطرہ کا مقابلہ کرنے کے لئے ہر وقت تیار و مستعد رہتے ہیں اور اس کے لئے جان تک دے دینے میں حیاتِ ابدی کا سرور پاتے ہیں۔ یہی ہیں وہ افراد جن کا عزم و استقلال، تعداد کی قلت اور سامانِ حرب و ضرب کی کمی کو اس طرح پورا کر دیتا ہے کہ ان میں کا ایک ایک فرد دشمن کے دس دس پر بھاری ہوتا ہے۔ یہی ہیں وہ جن کے متعلق کہا کہ — عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ رَحْمَةٌ ۔ (۲/۱۵۷) ان پر خود خدا سلام و رحمت کے پھول برساتا ہے۔ اور غدارانِ قوم کو ایسی الم انگیز سزا دیتا ہے جو ہر ملّت فروش کے لئے عبرت آموز ہو — سزا — اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ (۵/۳۳)

اس کے سوا، ہندو کے مستقل خطرہ سے محفوظ رہنے کی کوئی صورت نہیں ہو سکتی۔ وَ اللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ شَهِيْدٌ۔

والسّلام!

"آئندہ کا شمارہ ہے — "ہندو مذہب کیا ہے"

طلوعِ اسلام کا

مسلک و مقصد

۱۔ قرآن کریم مسلمانوں ہی کے لئے نہیں بلکہ تمام نوعِ انسانی کے لئے خدا کی طرف سے آخری مکمل اور محفوظ ضابطۂ ہدایت ہے۔ اسے سب سے پہلے نبی اکرمؐ نے عملاً متشکل کر کے دکھایا اس لئے حضورؐ کی سیرت کے نقوشِ قدم اسلامی زندگی کے لئے نشانِ راہ ہیں۔

۲۔ حضورؐ کی سیرتِ طیبہ کے متعلق جو باتیں ہماری کتبِ روایات و تاریخ میں آئی ہیں، ان میں سے وہی صحیح ہو سکتی ہیں جو نصِ قرآن کریم کے خلاف نہ ہوں۔

۳۔ جو حکومت نصِ قرآن کریم کے احکام و قوانین کو ملک میں عملاً نافذ کریگی اسے خلافت علیٰ منہاج نبوت یا اسلامی مملکت کہا جائے گا۔

۴۔ اس مملکت کا بنیادی فریضہ یہ ہوگا کہ وہ تمام افراد کی بنیادی ضروریاتِ زندگی ۔۔۔ خوراک، مکان، لباس، علاج، وغیرہ ۔۔۔ بہم پہنچانے اور ان کی انسانی صلاحیتوں کے نشوونما پانے کا انتظام کرے۔

۵۔ اس مملکت میں ملوکیت (یعنی خدا کے قوانین کے بجائے انسانوں کے خود ساختہ قوانین کا عمل) قضا کریسی (یعنی قانون کے معاملہ میں مذہبی پیشواؤں کے حکم کا قولِ فیصل سمجھے جانا) اور سرمایہ داری (یعنی رزق کے سرچشموں پر امت کی بجائے افراد کا قبضہ و اقتدار) نہیں ہوگا۔

۶۔ اسلامی مملکت میں مناصب و مدارج کا معیار جوہرِ ذاتی اور پختگیٔ سیرت و کردار ہوگا۔

۷۔ طلوعِ اسلام پاکستان میں اسی قسم کے نظام کے قیام کے لئے فکری اور آئینی کوشش کرتا ہے۔ اسکا تعلق نہ کسی سیاسی پارٹی سے ہے اور نہ ہی کسی مذہبی فرقہ سے۔ نہ ہی یہ کوئی نیا فرقہ ایجاد کرنا چاہتا ہے۔ کیونکہ فرقہ بندی قرآن کریم کی رُو سے شرک ہے۔ اُمت کے موجودہ فرقے جس طرح نماز، روزہ وغیرہ اسلامی شعائر کے پابند ہیں، یہ ان میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کرتا کیونکہ اس سے ملت میں انتشار پیدا ہوتا ہے۔

۸۔ اگر آپ ان مقاصد سے متفق ہو تو طلوعِ اسلام کی قرآنی فکر کی نشر و اشاعت میں اس کا ساتھ دیجئے!

ناظم